Khan Abdul Ghaffar Khan

آپ بیتی

خان عبدالغفار خان

ترتیب و پیشکش

جے پرکاش نارائن

پیش لفظ

پیش نظر کتاب ایک بیش بہا تصنیف ہے۔ بادشاہ خان کی سوانح عمریاں تو کئی شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں سے پیارے لال صاحب کی تصنیف کردہ سوانح عمری سب سے پہلے منظر عام پر آئی، بعد ازاں انگریزی میں ٹنڈولکر صاحب کی لکھی ہوئی شائع ہوئی۔ اور حال ہی میں جشی خاں نے بادشاہ خاں کی سوانح حیات مراٹھی زبان میں شائع کی ہے، لیکن یہ کتاب ''سرحدی گاندھی کی آپ بیتی ہے۔'' دوسروں کی نوشتہ سوانح عمریاں تو بہت ہو سکتی ہیں۔ لیکن آپ بیتی یا سرگزشت صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ اور جب وہ ایک حق پرست کی آپ بیتی ہوتی ہے تو وہ مستند بالذات ہونے کی وجہ سے لامثال بن جاتی ہے۔

بادشاہ خان غیر منقسم ہندوستان کی جنگ آزادی کے ہراول میں ایک سالار تھے۔ ان کے پر شجاعت عدم تشدد اہنسا کی وجہ سے ہندوستان نے انھیں سرحدی گاندھی کا لقب دیا تھا۔ اس دور یا نسل کے جو لوگ اس ملک میں اب تک زندہ ہیں۔ وہ تو خان عبدالغفار خاں کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں، لیکن دور حاضرہ کی نئی نسل کے لئے وہ ماضی کی ایسی تواریخی شخصیت بن کر رہ گئے ہیں۔ جس کی تاریخ دھندلی پڑ چکی ہے۔ اگر نئی نسل کو اس پرنور کردار کی کچھ جھلک نصیب ہو جائے۔۔۔۔ اس ضو پاش تجلی کا یک جلوہ میسر آ جائے تو شاید اس کے قدم ظلمت سے نور کی طرف بڑھ سکیں۔

اس کتاب کا کسی بھی وقت اشاعت پذیر ہونا ایک اہم واقعہ گردانا جاتا، لیکن ایک خاص سبب سے اس موقع پر اس کا منظر عام پر آنا اور بھی زیادہ اہمیت حاصل کر گیا ہے۔ناظرین کو معلوم ہوگا کہ ہمارے **ملک** میں ایک ''خان عبد الغفار خان سالگرہ سمتی'' کا قیام عمل میں آیا ہے۔جس کا صدر ہونے کا فخر مجھ ناچیز کو نصیب ہوا ہے۔اس سمتی کا اہم مقصد یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کی سویں سال گرہ کے سال رواں میں خان عبد الغفار خاں کو ہندوستان میں مدعو کیا جائے۔آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ بادشاہ خان نے ہماری دعوت کو قبول کرلیا ہے۔

اس طرح جب کہ ہندوستان کے عوام کو بادشاہ خان کی عظیم شخصیت کے دیدار ہونے والے ہیں۔اس کتاب کا اس تقریب پر شائع ہونا بلا شبہ بڑا برمحل ہے۔اور **ملک** کے لئے فیض رسان ثابت ہوگا۔شروع میں یہ کتاب ہندی، اردو، انگریزی ان تین زبانوں میں چھپ رہی ہے۔مجھے یقین ہے کہ تعلیم یافتہ میں کوئی بھی ایسا شخص نہ رہے گا جو اس مبارک موقع پر بادشاہ خان کی آپ بیتی سے بہرہ مند نہ ہو سکے۔

آخر میں شری کنور بھان نارنگ اور رام سرن نگینہ کا نیز گاندھی سمارک ندھی کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ ان کی محبت، عقیدت، محنت اور کاوش کی بدولت یہ بے نظیر کتاب عوام کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

جے پرکاش نرائن

نئی دہلی (۹-۳-۶۹)

تعارف

خدائی خدمت گار تحریک کے بانی اور عدم تشدد کے علم بردار خان عبدالغفار خان المعروف باچا خان کی بے مثال انقلابی شخصیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ نمایاں اور ان کے نظریات زیادہ پر کشش نظر آتے ہیں۔ جیسے جیسے اس عظیم شخصیت کے کارہائے نمایاں اہل دنیا کے سامنے آرہے ہیں۔ ویسے ویسے ان کی لازوال شخصیت بھی نکھر کر سامنے آرہی ہے۔

باچا خان کی علمی، روحانی، سماجی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ عصر حاضر تو یہ تقاضا کرتا ہے کہ ان کی شخصیت پر پی، ایچ، ڈی کے مقالات قلم بند کیے جائیں۔ اور باچا خان جیسی دیو مالائی شخصیت کے کردار کو دنیا کے سامنے لایا جائے۔ تاکہ آج جو دنیا کے تقریباً ہر خطہ میں قانون کی حکمرانی کی بجائے تشدد کی حکمرانی عالمی سطح سے لے کر تھانہ کی سطح تک قائم ہے۔ باچا خان کے نظریات اور افکار کی نہ صرف عالمی سطح پر بلکہ ہر سطح پر ضرورت ہے۔ آج وقت نے یہ امر سچ ثابت کر دکھایا ہے کہ ان کے افکار حقائق پر مبنی تھے۔

فکشن ہاؤس نے باچا خان کی انقلابی زندگی پر مبنی ان کی سوانح عمری کو خوبصورت انداز میں شائع کر کے حقائق جاننے والے طالبان علم کو گنج گراں مایہ سے نواز دیا ہے۔ یہ کتاب پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب کسی انسان سے کوئی بڑا کام لینا مقصود ہوتا ہے تو اس کو اوائل عمری میں ہی بابوں جیسے خیالات و

نظریات سے آگاہی میسر آجاتی ہے۔باچا خان کی یہ سوانح عمری اس حوالہ سے بھی تاریخ کے نوآموز طالب علموں کے لئے مشعل راہ ہے۔

وہ مرد مجاہد پندرہ سال تک فرنگیوں سے آزادی کی لازوال نعمت کے حصول کے لئے پابند سلاسل رہا۔پھر جب برصغیر کی تقسیم ہوئی تو قیام شدہ حکومت پاکستان کی حکومتی مشینری نے انہیں بڑی بے دردی سے دشمن وطن قرار دیتے ہوئے پندرہ سال تک جیل میں بند رکھا۔

اپنی ساری زندگی عوام کے حقوق کے حصول کے لئے کوشاں رہنے اور جبر وتشدد کے مقابلے میں عدم تشدد کا علم بلند کرنے والے باچا خان نے ہر حال میں یہ ثابت کردیا کہ تاریخ سے بڑا کوئی جج نہیں ہوتا۔شاید آج یہی تاریخ اسی نظریہ کی وجہ سے انہیں عظیم ہیرو کے طور پر اپنے روشن ابواب میں شامل کرچکی ہے۔باچا خان کے نظریات اور جدوجہد یقیناً رہتی دنیا تک قابل ستائش اور لائق تقلید ہوں گے۔

عبدالستار

اتمان زئی۔۔۔۔میرا گاؤں

میں ہشت نگر کے جواب اشتغر کے نام سے مشہور ہے۔اتمان زئی گاؤں میں خان بہرام خان کے یہاں پیدا ہوا۔اس وقت اول تو ہمارے گاؤں میں یہ رواج نہیں تھا کہ جب بچہ پیدا ہوتو اس کے والدین اس کی تاریخ وسن پیدائش اپنے پاس لکھ کر رکھ لیں۔اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔اسی وجہ سے میری پیدائش کی تاریخ کسی نے نہیں لکھی تھی۔لیکن میری ماں مجھ سے کہا کرتی تھی کہ میرے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب کی جب شادی ہوئی تھی تو تب میں گیارہ سال کا تھا۔چونکہ ان کی شادی 1901ء میں ہوئی تھی۔اس لئے میں بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں 1890ء میں پیدا ہوا تھا۔

میرے والد گاؤں کے ایک بہت بڑے خان تھے۔لیکن ان میں خانیت کے غرور ونخوت کا شائبہ تک نہ تھا۔وہ نہایت منکسر المزاج،خدا پرست،متقی،پرہیز گار انسان تھے،وہ ظالم کے بمقابلہ مظلوم کے حمایتی تھے۔فراخ دلی اور رحم وکرم ان کی فطرت کا خاصہ تھے۔کوئی ان کا برا بھی کرتا تو بدلہ چکانے کے اہل ہونے کے باوجود وہ درگزر کر دیتے اور بردباری سے کام لیتے،اور ہمیشہ برائی کا جواب بھلائی سے دیتے۔

ایسی ہی فیاض طبع میری والدہ بھی تھیں۔وہ ہمیشہ ایک ہانڈی سالن اپنے گلی محلے کے لئے پکایا کرتی تھیں۔اوران سب میں تھوڑا تھوڑا بانٹ دیا کرتی تھیں۔اسی طرح ہمارے حجرے میں جو مسافر آکر ٹھہرتے تھے۔اور جنھیں کوئی بھی جانتا پہچانتا

نہ تھا۔اور نہ ہی اس قسم کے مسافر کسی کے مہمان ہوتے تھے۔ایسے مسافروں کے لئے میرے والد خود روٹی لے کر جایا کرتے تھے۔حالانکہ اس قسم کے کاموں کے لئے گھر میں نوکر چاکر موجود ہوتے تھے۔والد صاحب روٹیوں کی ٹوکری اپنے سر پر اور سالن کا برتن ہاتھوں میں اٹھا لیتے تھے۔حجرے میں پہنچ کر اجنبی مسافروں کو کھلاتے پلاتے۔وہ کہا کرتے تھے کہ یہ مسافر جنھیں نہ کوئی جانتا ہے اور نہ پہچانتا ہے۔خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے مہمان ہیں،اس لئے میں خود ان کے لئے کھانا لے کر جاتا ہوں۔

دوسرے خوانین کی مانند میرے والد صاحب حاکم پرست نہیں تھے۔اور نہ ہی دوسرے خوانین کی طرح وہ حکام سے تعلقات قائم کرتے تھے۔ان کی خدمت اور خوشامد کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔میرے والد صاحب کی خودداری کی یہ صفت میرے دادا محترم سے ورثہ میں ملی تھی۔میرے دادا کا نام سیف اللہ خان تھا۔اس زمانے میں جب ہر کاوئے پر جنگ جاری تھی اور انگریز بونیز کے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتے تھے تو اس وقت ہمارے ملک کے خوانین انگریزوں کی حمایت اور امداد کرنے لگے تھے۔لیکن میرے دادا سیف اللہ خان نے اپنی مظلوم قوم کا ساتھ دیا تھا۔جس طرح غازی ان فرنگیوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔اسی طرح میرے دادا نے بھی غازیوں میں شریک ہو کر مورچہ سنبھال رکھا تھا۔اور اسی طرح انگریز جب بھی صوبہ سرحد کے لوگ سے لڑائیاں لڑنے اور ان پر چھاپہ مارتے،اور انھیں غلام بنانے کی کوشش کرتے تو میرے دادا سیف اللہ خان ہمیشہ قوم کے ساتھ شانہ بشانہ ہو کر

لڑتے تھے۔

میرے پردادا عبید اللہ خان اپنی روشن دماغی اور قومی پروری کی بنا پر درانیوں کے ہاتھوں تختہ دار پر لٹکائے گئے تھے۔ کیونکہ اس وقت ہمارے ملک پر درانیوں کا تسلط تھا۔ اور میرے پردادا اپنی قوم میں ایک بارسوخ طاقتور اور ہر دل عزیز رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔

درانیوں کے بعد جب انگریزوں کی حکوت ہوئی تو ہمارا علاقہ اس وقت پنجاب سے ملا ہوا تھا۔ پنجاب میں انگریزوں نے پنجابیوں کی تعلیم کے لئے بہت سے مدرسے کھول رکھے تھے، لیکن ہمارے ملک میں تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ پٹھانوں کے ساتھ انگریزوں کی کوئی ہمدردی نہ تھی اور نہ ہی پنجابیوں کو ہم سے کوئی ہم دردی تھی۔ ہمارے ہاں محکمہ تعلیم کے تمام افسر پنجابی تھے۔ اور اسی وجہ سے ہمارے وطن میں تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ کہیں کہیں بعض بڑے بڑے گاؤں میں اگرا کا دکا پرائمری سکول تھے، تو ان میں کہیں کہیں ایک استاد بیٹھا ہوتا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ہر ایک قوم کو اپنی مادری زبان میں تعلیم دینے کا طریقہ رائج کر رکھا تھا، لیکن ہم ہی واحد بدقسمت قوم تھے کہ اول تو ہمارے ملک میں تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ اور کچھ تھا بھی تو یہ کہ ہمارے بچوں کو پرائی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ انگریزوں نے ایک طرف تو ہمارے لئے خال خال ہی مدرسے قائم کیے تھے۔ اور دوسری طرف ایسے نام نہاد ملانٹوں کو ہمارے پیچھے لگا رکھا تھا۔ جو یہی فتویٰ صادر کیا کرتے

تھے کہ ''ان مدرسوں میں سبق پڑھنا کفر ہے۔'' ان لوگوں کے پروپیگنڈے کا محور یہ عجیب وغریب تھا کہ

سبق	چہ	دمدرسے		وائی
پارہ		دپیسے		وائی
جنت	کے	بہ	زائے نہ	دی
دوزخ	کیبہ	گھسے		وہی

جو لوگ مدرسے میں سبق پڑھتے ہیں، وہ پیسوں کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ ان کو جنت میں جگہ نہیں ملے گی۔ وہ دوزخ میں دھکے کھاتے پھریں گے۔ اس پراپیگنڈا کا اصل مطلب یہ تھا کہ پٹھان بے علم اور جاہل رہ جائیں اور یہی وجہ تھی کہ پٹھان ہندوستان بھر میں تعلیم کے لحاظ سے سب سے پس ماندہ تھے۔

پٹھان بچوں کے لئے تحصیل علم کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ مسجدوں میں کسی قدر مذہبی تعلیم کے نام سے درس وتدریس کا تھوڑا بہت انتظام تھا۔ لیکن وہ ملا لوگوں کے لئے تھا۔ اور اکثر لوگ یہ تعلیم امامت کے لئے حاصل کیا کرتے تھے۔ عام پختونوں کی اس میں کوئی دل چسپی نہ تھی۔

چونکہ اسلام سے پہلے پختون ہندو تھے، اور ہمارے سماج میں بھی وہ غلط دستور رائج تھا کہ ''علم (ودیا) صرف برہمنوں کے لئے تھا۔'' اس دستور کے تحت ہم بھی اس طرح تقسیم ہو چکے تھے جیسا کہ ہندو الگ الگ ٹکڑوں میں تھے۔

میرے والد صاحب نے خود تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ لیکن علم سے ان کو بہت

پیار اور شغف تھا۔ میں پانچ چھ سال کا تھا کہ مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملا کے پاس بٹھا دیا گیا، ملا بے چارہ تو خود ہی علم و ادب سے بے بہرہ اور لکھنے پڑھنے سے عاری تھا، وہ بھلا مجھے کیا پڑھاتا اور لکھاتا؟۔ اسے قرآن شریف کی چند ایک سورتیں یاد تھیں نیز وہ قرآن شریف پڑھ ضرور سکتا تھا، لیکن معنی و مطلب بالکل نہیں سمجھتا تھا۔ ملا صاحب نے مجھے سپارہ پڑھانا شروع کر دیا۔ سپارہ خوانی شروع کرتے وقت میرے ماں باپ نے مٹھائی بانٹی اور میرے اس آغاز تعلیم پر بہت خوشیاں منائیں۔

عجیب بات تھی کہ ملا صاحب نے مجھے الف، ب، ت تو نہیں پڑھائی تھی، لیکن سپارہ پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ غور فرمایئے جب ایک آدمی حروف تہجی سے واقف نہیں تو وہ سپارہ کیسے پڑھ سکے گا۔ لیکن اس میں ملا بے چارے کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ اس زمانے میں پڑھانے کا یہی طریقہ ہمارے دیس میں مروج تھا۔

ہمارا استاد بڑا ظالم تھا۔ اور ہمیں بڑی بے دردی سے پیٹا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ میں میں نے قرآن شریف ختم کر لیا۔ میرے ماں باپ نے قرآن شریف ختم ہونے پر بڑی خوشیاں منائیں۔ بڑی بھاری خیرات بھی کی اور ملا کو بھی بہت سے روپے دیئے۔

پٹھانوں میں علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ اور اکثر لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کے لئے مسجدوں میں بھیجتے تھے۔۔ کیونکہ بچوں کے درس و تدریس کے لئے کوئی اور ادارہ یا مدرسہ نہیں ہوتا تھا۔ بفرض محال ملک کے بڑے بڑے شہروں میں کہیں مدرسے تھے بھی تو ملا ملانٹے ان میں پڑھنے کے لئے لوگوں کو نہیں جانے دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ "دنیا

کا یہ علم کفر ہے۔'' چنانچہ انھوں نے اپنے شاگردوں اور ان پڑھ لوگوں کو یہ شعر یاد کرا رکھے تھے کہ سبق چہ دمدرسے وائی

پارہ دپیسے وائی

جنت کے بہ زائے نہ دی

دوزخ کیبہ گھسے وہی

جو لوگ مدرسے میں سبق پڑھتے ہیں، وہ پیسوں کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ ان کو جنت میں جگہ نہیں ملے گی۔ وہ دوزخ میں دھکے کھاتے پھریں گے۔

لیکن میں خوش نصیب تھا کہ خدا نے مجھے ایک دلاور، پاک باز اور ایمان دار باپ اور نیک طینت ماں دی تھی۔ جو مسجد کے ملانوں کے فتوؤں اور اردگرد کے لوگوں کے واویلا اور آوازوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے میرے بھائی ڈاکٹر خان کو مدرسہ بھیج دیا، اور میرے خیال میں ہشت نگر بھر میں یہ پہلا لڑکا تھا، جسے تعلیم کے لئے مدرسے بھیجا گیا تھا۔ جب میں نے قرآن شریف ختم کرلیا تو مجھے بھی مدرسہ بھیج دیا گیا۔ اس وقت میری عمر آٹھ سال تھی، اور ملانے چھپ چھپ کر ہمارے خلاف لوگوں میں باتیں کیا کرتے تھے۔ لیکن انھیں کھلے عام ہمارے خلاف باتیں کرنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ اور نہ ہی وہ ہمارے خلاف کفر کا فتویٰ لگانے کی جرات کرسکتے تھے۔ کیونکہ میرے والد صاحب کو ایک خان ہونے کی حیثیت سے خاص سماجی اقتدار نصیب تھا، مولاناؤں کے لئے ان پر انگشت نمائی کرنا ٹیڑھی کھیر تھا۔

پشتونستان۔۔۔آریاؤں کا پہلا مسکن

یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ہمارا دیس جو تاریخ کے مختلف ادوار میں علم وادب اور تہذیب وتمدن یا ثقافت کا گہوارہ رہا تھا۔تاریخ کے نا مساعد حالات، ملا مولاناؤں کی جہالت اور گرواٹ کی وجہ سے اس حالت تک گر گیا کہ اس میں تقسیم جیسے نیک کاموں کے لئے بھی گنجائش نہ رہی۔

ہمارے اس دیس میں مختلف ثقافتیں اور تمدن گزر چکے تھے۔ایک وقت تھا کہ یہ علاقہ آرین تہذیب کا گہوارہ تھا۔

پھر اس ملک میں بدھ مت کا دور دورہ شروع ہوا، اس دور میں ہمارے ملک نے بڑی ترقی کی۔اور یہ دور ایک عظیم معاشرے کے آثار اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔آج بھی مہاتما گوتم بدھ کے دو عظیم الشان مجسمے بامیان میں موجود ہیں، جو دنیا بھر میں مہاتما بدھ کے سب سے بڑے مجسمے ہیں۔اور پہاڑ کے دامن میں فن اصنام کے کمال کی بے مثل نظیر پیش کر رہے ہیں۔

بامیان کے دامن کوہ میں مہاتما گوتم بدھ کے مجسموں کے چاروں طرف سارے پہاڑ میں جگہ جگہ غاریں بنی ہوئی ہیں۔ان غاروں میں بدھ مذہب کے راہب، پیشوا، روحانی معلم اور طالب علم رہا کرتے تھے۔بامیان کے علاوہ جلال آباد کے گرد ونواح میں ہڈہ کے مقام پر بدھ مذہب کی عظیم یونیورسٹی تھی۔جس کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔یہی حال ٹیکسلا کا تھا۔ان مقامات پر سنگ تراشی، صنم

گری،تعمیرات کے نمونوں، پتھر ولکڑی سے متعلقہ فنون لطیفہ کے آثار پائے گئے ہیں۔آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہم پٹھان لوگ ایک بلند تمدن اور کلچر کے مالک تھے۔اور ہم نے اس قدر ترقی کی تھی کہ اپنے ملک سے باہر چین اور مشرق بعید تک ہمارے بازو پھیلے ہوئے تھے۔اس طرح ہم نے اپنے کلچر اور مہاتما بدھ کے پیغام سے دنیا کو بھی روشناس کرادیا۔

دو تین سال قبل ہمارے گاؤں کے قریب آثار قدیمہ کے محکمہ والوں نے کھدائی کی تھی۔اس کھدائی سے زمین کے نیچے سے ایک شہر برآمد ہوا تھا۔کہا جاتا ہے کہ یہ شہر گندھارا کے شاہی خاندان کا مرکز تھا۔اور اگر ہم تاریخ کے دھندلکے میں تھوڑا سا اور پیچھے چلے جائیں تو پٹھانوں کا یہ ملک جو اس وقت افغانستان اور پشتونستان کے نام سے مشہور ہے۔نوع انسانی کے لئے ایک عظیم خاندان کا گہوارہ رہ چکا ہے۔

تاریخ دانوں کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آرین نسل نے سب سے پہلے اسی ملک میں دریائے آمو کے کنارے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔اور پھر اسی دھرتی پر اس نے عروج کا کمال حاصل کیا تھا۔بعد میں جب اس قوم کی تعداد بڑھ گئی اور ملک میں بھیڑوں کے ریوڑ رکھنے کی جگہ نہ رہی تو آہستہ آہستہ اس کے افراد نے نئے نئے ملکوں کی طرف کوچ کرنا شروع کردیا۔یہ لوگ ایک طرف سے تو ایران کی سمت سے یورپ کو چلے گئے،اور دوسری جانب ہندوستان کی طرف بڑھ گئے۔اور جدا جدا قوموں میں تقسیم ہو گئے، جہاں بھی وہ گئے۔انھوں نے جغرافیائی حالات اور ملکی اثرات کے تحت جدا جدا تمدن اور زبانیں اختیار کرلیں۔لیکن آریا نسل کے یہ لوگ

جب اس سے پہلے اپنے ابتدائی وطن ''اریاناویجو'' موجودہ افغانستان اور پختونستان میں رہتے تھے تو ان کی ایک ہی بولی زبان تھی جسے اب ''آریک زبان'' کا فرضی نام دیا گیا ہے۔ اسی ''آریک زبان'' کی قربت اب پشتو زبان کو حاصل ہے۔

پٹھان اونچے اونچے اور نا قابل عبور پہاڑوں اور دروں میں آباد تھے۔ اور بیرونی اثرات سے نسبتاً محفوظ تھے۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا یہی **ملک** ''آریا ناویجو'' جس میں تاریخ کے اولین دور کے پیغمبر زرتشت نے جنم لیا تھا۔ زرتشت بلخ کے رہنے والے تھے۔ مگر بعد میں ایران چلے گئے تھے۔ لیکن ان کی کتابیں اب بھی بلخ کی تعریف وتوصیف سے معمور ہیں۔ جن سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ یہی وہ سرزمین تھی کہ جہاں ہندو دھرم کے مقدس وید کے گیتوں نے جنم لیا۔ اور یہی وہ **ملک** ہے کہ جس کے ایک فرزند پانئی نے سنسکرت زبان کی گرائمر لکھی۔ اور اسے ایک ادبی زبان کے طور پر دنیا کو متعارف کیا۔ یہ پائنی رشی دریائے سندھ کے کنارے حالیہ تحصیل صوابی کا ایک باشندہ ہے۔

اسی طرح اس **ملک** کے ایک دریا اور پشتو کے ایک لفظ، جس سے ہندو نام بنا ہے۔ یہ سندھ سے اخذ کیا گیا ہے۔ جسے سندھی کہا جاتا ہے، یاد رہے کہ پشتو میں ہر ایک دریا کو سندھ کہا جاتا ہے۔ آریاؤں کے اس مشترکہ خاندان میں، جس سے بہت سے آریا دوسرے علاقوں میں چلے گئے تھے۔ دو بڑے گھرانے باقی رہ گئے تھے۔ جن میں سے ایک پشتو ہے اور دوسرا بلوچ نام سے مشہور ہے۔ یہ دونوں اب بھی اپنے اس پرانے وطن میں رہ رہے ہیں۔ اس کی حفاظت اس کی تعمیر وترقی کا

کام خدا نے انہی کے سپرد کر رکھا ہے۔

ہمارے اس دیس میں بعد میں اسلام آیا۔لیکن اسلام جس وقت اس **ملک** میں آرہا تھا۔اس وقت عربوں میں وہ روحانی روشنی،خدائی جذبہ اور تقویٰ باقی نہیں رہا تھا۔جو پیغمبر اسلام لائے تھے یا جس سے ابوبکر اور عمر جیسی عظیم شخصیتوں نے اپنی عملی زندگی اور بلند کردار کے ذریعہ عوام کو متعارف کرایا،اس وقت جب کہ اسلام ہمارے **ملک** میں وارد ہوا،عرب شہنشاہیت اور مطلق العنانی میں مست ہو چکے تھے۔اور انھیں **ملک** گیری کی ہوس نے اندھا کر رکھا تھا۔ان میں تبلیغ کا جذبہ اور نیکی پھیلانے کی اسپرٹ مفقود ہو چکی تھی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سے ہمارا شاندار تمدن اور شائستہ کلچر تو لے لئے گئے۔لیکن اس کے بدلے ہمیں اسلام کی وہ اصلی شکل نہ دی گئی،جو پیغمبر اسلام لے کر آئے تھے۔اس کے باوجود ہمارے بعض علم دوست اور خدا رسیدہ لوگ اسلام کی تلاش میں اسلامی دنیا گھومے۔اور انھوں نے اسلامی فلسفہ،علم و دانش،اور تصوف میں اپنے لئے ایک بلند مقام پیدا کر لیا۔جس پر ہم لوگ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔اور برصغیر کا ایک بڑا حصہ مسلمان ہو گیا۔انہی بزرگوں کے سر کا صدقہ اب پاکستان بنا ہوا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ جن پٹھانوں نے پاکستانی علاقہ کے اسلاف کو اسلام دیا تھا۔اس کے ساتھ پاکستان کا سلوک کیسا ہے؟۔

فوجی نوکری کا شوق

میں نے ابتدائی تعلیم پشاور کے میونسپل بورڈ ہائی سکول میں حاصل کی، اس کے بعد پشاور کے مشن ہائی سکول میں داخل ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میرا بھائی اسی سکول کا کورس ختم کر کے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بمبئی چلا گیا۔ اور میں مشن ہائی سکول میں اپنے ایک نوکر بارانی کاکا کے ساتھ رہ گیا۔ بارانی کاکا مجھے فوج کے قصے کہانیاں سناتا اور کہا کرتا تھا کہ فوج کی نوکری بڑی باعزت اور بہت اچھی نوکری ہے۔ اگر کوئی آدمی فوج میں سالار کی وردی میں ملبوس ہو اور کرچ وغیرہ فوجی اسلحہ سے لیس ہو کر اپنی کمپنی کے آگے چل رہا ہو اس کی شخصیت سے عجیب رعب داب اور تمکنت و حشمت ٹپکتی ہے۔

بارانی کاکا کی باتوں نے میرے اندر بھی فوجی نوکری کے لئے زبردست شوق پیدا کر دیا۔ اور میں نے اپنے ماں باپ سے صلاح مشورہ کیے اور اجازت لیے بغیر ایک درخواست ڈائریکٹ کمیشن ہندوستان کے کمانڈر انچیف کو بھیج دی۔ اس کے بعد میں اس درخواست کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ دستور کے مطابق کمیشن عطا کرنے سے پہلے سرکار امیدوار کے متعلق ضروری تحقیقات عمل میں لاتی ہے۔ اور اس کے لئے کچھ عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اس دوران میں نویں جماعت پاس کر کے دسویں جماعت میں داخل ہو چکا تھا۔ اب جب میٹرک کا امتحان شروع ہوا اور میں لگ بھگ آدھے پرچے دے چکا اور آدھے پرچے ابھی دینے باقی تھے کہ مجھے ایک

سرکاری حکم نامہ ملا کی کہ ''تمہارا ڈائریکٹ کمیشن منظور کیا جا چکا ہے۔'' اور تم کل صبح بھرتی کے لئے دس بجے دفتر میں حاضر ہو جاؤ۔ یہ حکم نامہ میرے لئے غیر معمولی خوشی کا باعث تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں ڈائریکٹ کمیشن کا حصول بڑی اہم بات تھی۔ میں نے اس خوشی میں امتحان دینا چھوڑ دیا، اور بھرتی افسر کے دفتر میں چلا گیا۔ میرا معائنہ ہوا اور میرا نام ڈائریکٹ کمیشن میں درج ہو گیا۔

انھیں دنوں میرے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب بمبئی سے انگلینڈ روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر ایک میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے۔

مجھے ڈائریکٹ کمیشن میں لے لیے جانے کی منظوری ملنے پر میرے والد صاحب بہت مسرور ہوئے''۔ ان دنوں ملتان میں گائیڈ کے نام سے رسالہ اور پلٹن مقیم تھی۔ یہ پلٹن تمام ہندوستان کی فوج میں بڑی عزت اور شہرت کا مقام رکھتی تھی۔ اس میں بڑے بڑے لوگوں کے لڑکے بھی بڑی مشکل سے سپاہی بھرتی کیے جاتے تھے۔ اور پنجاب کے بڑے بڑے لوگوں کے لڑکے اس میں لانس نائیک تھے۔ میں اسی پلٹن میں ڈائریکٹ کمیشن پر اس لیے جا رہا تھا کہ میں ایک نہایت خوب صورت جوان تھا۔ چھ فٹ اور تین انچ میرا قد تھا۔ اور میٹرک تک میری تعلیم تھی۔ انہی وجوہات سے اس پلٹن کے انگریزوں کو مجھ سے محبت اور رغبت تھی۔ اور ان کی خواہش تھی کہ میں اس پلٹن میں شامل ہو جاؤں۔ میرے والد صاحب بھی اس میں رضامند اور بہت خوش تھے۔ لیکن ایک دن میں پشاور میں ایک دوست سے ملنے گیا۔ جو اس رسالہ میں رسالدار تھا۔ میں اور وہ کھڑے تھے کہ اس دوران ایک فرنگی جو اس رسالہ میں

لیفٹیننٹ تھا۔آیا۔رسالہ دار صاحب ننگے سر کھڑے تھے،اور سر کے بال فیشن ایبل تھے۔اس انگریز نے جب رسالہ دار کے بالوں کا یہ فیشن دیکھا تو بہت غضب ناک ہوا اور بولا،ویل ڈیم سردار صاحب تم بھی انگریز بننا چاہتا ہے۔'' یہ سن کر رسالہ دار کا رنگ فق ہو گیا۔اور اس میں اتنی بھی جرات نہ رہی کہ وہ اس بات کا اسے کوئی جواب دیتا۔میں نے جب یہ نظارہ دیکھا تو اس کا مجھ پر بڑا سخت اثر ہوا۔مجھے تو ''بارانی کا کا فوجیوں کی عزت کی باتیں سنایا کرتا تھا''۔لیکن یہاں مجھے ذلت ہی ذلت نظر آئی،میں نے اس دن سے انگریزوں کی نوکری کا خیال چھوڑ دیا۔لیکن میرے بابا جان نے میرے اس خیال کی سخت مخالفت کی،وہ مجھ سے ناراض بھی ہو گئے،کیونکہ ان دنوں ڈائریکٹ کمیشن حاصل ہونا ایک بہت بڑی چیز تھی۔لیکن مجھے وہ بڑی چیز نہیں دکھائی دی،اور نہ ہی مجھے اس میں کسی قسم کی کوئی عزت نظر آئی،بلکہ مجھے تو ایک حقیر،ہلکی،اور گری ہوئی چیز دکھائی دی۔

ڈائریکٹ کمیشن ٹھکرا دینے کی وجہ سے بابا جی مجھ سے سخت ناراض ہوئے تھے۔ اس لئے میں نے اس کے متعلق اپنے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب کو ایک خط بھیجا اور اس میں میں نے لکھا کہ میں نے انگریزوں کی نوکری کا خیال ترک کر دیا ہے۔کیونکہ اس میں کوئی عزت نہیں ہے۔

بلکہ غلامی اور ذلت ہے'' ڈاکٹر خان صاحب میرے اس فیصلہ سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے ابا جان کو لکھ دیا کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ صحیح اور شائستہ فیصلہ ہے لہٰذا وہ مجھے مجبور نہ کریں اور نہ ہی ناراض ہوں۔

میں نے پھر تعلیم کی طرف رجوع کیا۔انہی دنوں میں اپنے ایک اور ساتھی کے ہمراہ کیمبل پور چلا گیا۔اور کیمبل پور کے ہائی سکول میں ازسرنو داخل ہو گیا لیکن اس جگہ بڑی سخت گرمی تھی اور میری طبیعت وہاں نہ لگ سکی ۔ میں اس جگہ سے قادیان چلا گیا لیکن یہاں کی فضا بھی مجھے پسند نہ آئی ۔وہاں رات کو میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں ایک خوبصورت گہرے کنویں میں گر پڑا ہوں ۔اسی اثناء میں ایک آدمی وہاں آتا ہے اور کنویں کے اندر میری جانب اپنا لمبا ہاتھ بڑھاتا ہے اور میں اس کے ہاتھ کو پکڑ لیتا ہوں اور وہ شخص مجھے کنویں سے باہر نکال لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہتا ہے۔ ''کیا تمہیں یہ کنواں نظر نہیں آتا۔آ کر اس میں اپنے آپ کو کیوں پھینکتے ہو''علی الصباح جاگا تو یہ قصہ میں نے اپنے ساتھی کو سنایا اور ہم دونوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ اس جگہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ ہم وہاں سے واپس اپنے گاؤں آ گئے۔

میرا وہ ساتھی تو پشاور کے ایک ہائی سکول میں داخل ہو گیا اور میں اپنے گاؤں سے علی گڑھ چلا گیا وہاں کالج میں داخل ہو گیا۔لیکن مجھے رہائش کے لیے بورڈنگ میں جگہ نہ ملی ۔چنانچہ میں نے علی گڑھ کے ایک ہوٹل میں رہائش اور خورد ونوش کا انتظام کر لیا۔یہ کالج علی گڑھ شہر سے جہاں وہ ہوٹل تھا دور تھا۔دن کا وقت میں کالج میں گزارتا اور رات کو شہر چلا آتا۔

کچھ دنوں کے بعد کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں اور میں واپس اپنے گاؤں چلا آیا۔گاؤں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ ولایت سے میرے بھائی کا ایک خط

میرے بابا جی کے نام آیا ہے۔ اس خط میں میرے متعلق لکھا تھا کہ بہتر یہ ہوگا کہ میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت چلا جاؤں۔ اور انہی کے پاس ٹھہروں۔ وہاں بھائی صاحب ڈاکٹری پڑھ رہے تھے اور میرے لیے انہوں نے انجنئرنگ کا موضوع تجویز کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جیومیٹری میں بہت لائق تھا۔ بھائی صاحب کی اس تجویز کے پیش نظر ابا جان نے میرے ساتھ صلاح مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ میں بھی لندن چلا جاؤں۔ اس فیصلہ کی اطلاع ڈاکٹر خان صاحب کو بھجوا دی۔ ڈاکٹر صاحب نے میری پی۔ این۔ او۔ جہاز میں جگہ ریزرو کروالی۔ اور بابا نے مجھے تین ہزار روپے بھی دیے اور میں جانے کے لیے بالکل تیار ہو گیا لیکن جب میں رخصت لینے کے لیے اپنی والدہ صاحبہ کے پاس گیا اور جانے کے لیے ان سے اجازت مانگی تو وہ رونے لگیں۔ مجھے انہوں نے جانے کی اجازت نہ دی۔ میں نے انہیں سمجھانے کی انتہائی کوشش کی لیکن میں انہیں قائل نہ کر سکا۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ وہ ذرا اپنے دیش کو تو دیکھیں اس کی کیا حالت ہے۔ انگریزوں نے یہاں کے لوگوں میں پھوٹ پارٹی بازی اور طرح طرح کے نفاق پیدا کر رکھے ہیں یہاں بے گناہ لوگ موت کے گھاٹ اتارے جاتے ہیں۔ پھر بے گناہ لوگوں پر ہی مقدمے اور دعوے دائر ہوتے ہیں۔ آپس کی پارٹی بازی اور بغض وعناد کی وجہ سے اکثر گناہ گار بری ہو جاتے ہیں اور بے گناہ قید کی اذیتیں جھیلتے ہیں۔ یہاں تو کسی بھی انسان کی زندگی محفوظ نہیں ہے۔ یہاں سیکھنے کو کیا رکھا ہے۔ میری ان باتوں کا والدہ صاحبہ پر کچھ اثر نہ ہوا وہ میرے ساتھ متفق نہ ہوئیں۔ لوگوں

نے ان کے دماغ میں یہ بات بٹھلا دی کہ ایک دفعہ اگر کوئی اس **ملک** سے ولایت چلا جاتا ہے تو وہ ایسا **ملک** ہے کہ اس سے کوئی واپس نہیں آتا۔ ان کا ایک بیٹا پہلے ہی ولایت جا چکا ہے تو وہ واپس آنے سے رہا۔ اور اب یہ دوسرا ابھی اس کے پیچھے چلا گیا تو ان کی بھی یہی حالات ہوگی۔ جو لاوارث اور اولادِ نرینہ سے محروم ماں کی ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ ان کا بھی کوئی نام لیوا اور پانی دیوا نہیں رہے گا۔

چونکہ ہم دو ہی بھائی تھے ایک تو پہلے ہی ولایت جا چکا تھا۔ اور اب میں ہی ان کی دل جمعی کے لیے پاس تھا۔ بھائی صاحب کی عدم موجودگی میں وہ مجھے ہی دیکھ کر دل کو تسکین دے لیا کرتی تھیں۔ انہیں میری جدائی گوارا نہیں تھی۔ اس لیے وہ مجھے بدلیس جانے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

دراصل ماں سے مجھے بھی بہت محبت تھی اور وہ بھی مجھ سے بے حد پیار کیا کرتی تھیں۔ میں ان کی اجازت کے بغیر انگلینڈ نہیں جانا چاہتا تھا۔ اور جب انہوں نے مجھے جانے کی اجازت نہ دی تو میں انگلینڈ جانے سے رہ گیا اور ولایت کا خیال ہی میں نے ترک کر دیا۔ اب میں نے **ملک** وملت اور خدا کی مخلوق کی خدمت کرنے کا ارادہ کر لیا۔

☆☆☆

نام نہاد ملا اور انگریز گٹھ جوڑ

۱۹۰۱ء میں انگریزوں نے ہمارے صوبے کو پنجاب سے علیحدہ کر دیا اور ہمارے صوبے میں ایک وحشیانہ قانون کا نفاذ کر دیا۔ ایسا قانون تو شاید ہلاکو خان نے بھی لوگوں پر نافذ نہیں کیا تھا۔ اس کا نام ''فرنٹیر کرائمز ریگولیشن ایکٹ'' تھا۔ ایک تو یہ قانون بذات خود بہت سنگدلانہ تھا اور اسے کالا قانون کہنا بجا تھا۔ اس پر غضب یہ تھا کہ فرنگیوں نے اسے برے طریقے سے استعمال کیا کہ اسے پٹھانوں کی پارٹی بازی اور پھوٹ اور باہمی دشمنیاں پیدا ہونے لگیں۔ ان کی اجتماعی زندگی انفرادی زندگی میں بدل گئی۔ علاوہ ازیں اس گندے قانون نے ہماری عزت اور خودداری کو زبردست نقصان پہنچایا اور ہماری مستورات کو کھینچ کر کچہریوں میں پہنچا دیا۔ یہ اس قسم کا قانون تھا جو آدمی انگریزوں کو ناپسند کرتا تھا اس پر پولیس ایک فرضی مقدمہ بنا لیتی تھی ایسے مقدموں میں ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی فرنگی اس آدمی پر جرگہ بٹھا دیا کرتا تھا اہل جرگہ بھی ان کے اپنے ہی آدمی ہوا کرتے تھے جو اس آدمی کو چودہ سال قید کی سزا دے دیتے تھے۔

ایک مثال حبیب نور کی پیش کرتا ہوں۔ ۱۹۳۱ء میں کانگریس کی تحریک میں جب چارسدہ میں انگریزوں نے خدائی خدمتگاروں پر بے حد مظالم برپا کیے تو اس سے حبیب نور کو بہت صدمہ پہنچا۔ ان کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا۔ پھر کیا تھا جب چارسدہ کا انگریز اسسٹنٹ کمشنر کچہری جانے لگا تو یہ اس کے پاس چلے گئے

اور انگریز اسسٹنٹ کمشنر کو اپنے طمنچے یعنی پستول سے جہنم رسید کرنا چاہا لیکن ان کا پستول فیل ہو گیا۔ تب حبیب نور نے اس فرنگی کو اوپر اٹھالیا اور زمین پر زور سے پٹک دیا اور کہا ''لو تمہیں مار تو نہیں سکا چلو ذلیل کر دوں''۔ پولیس موقع پر پہنچ گئی اور انہیں گرفتار کر لیا گیا اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پھانسی دے دی گئی۔ یہ تو میں نے آپ لوگوں کے سامنے صرف ایک ہی مثال بیان کی ہے اسی طرح اور بے شمار لوگ تھے جن کے ساتھ اس سے بھی زیادہ ظلم ہوئے۔

اس کالے قانون کی ایک اور دفعہ ہے جسے ''دفعہ چالیس'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ دفعہ اخلاقی جرم کے متعلق تھی۔ لیکن انگریز عمر بھر اسے سیاسی قیدیوں کے خلاف استعمال کرتے رہے۔ انگریز تو خیر غیر ملکی حکمران تھے ان سے کیا گلہ یا شکوہ شکایت ہو سکتی تھی غضب تو یہ ہے' پاکستان کے ملکی حکمرانوں نے بھی ابھی اس کالے قانون کو وطن پرست پٹھانوں پر لاگو کر دیا ہے۔ اگر ایک آدمی راستہ پر چل رہا ہو گا تو یہ اسے پکڑ لیں گے اور کہیں گے کہ ضمانت دے دو۔ وہ انہیں کہے گا کہ مُیں نے کیا گناہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہو گا کہ اس بات کے بتانے کی چنداں ضرورت نہیں اگر ضمانت دیتے ہو تو بہتر' ورنہ جاؤ تین سال کے لیے قید خانے کی ہوا کھاؤ۔

میں نے اور میرے ہزاروں اور خدائی خدمت گار بھائیوں نے اس دفعہ کے تحت قیدیں کاٹی ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں انگریزوں نے جب ہمیں پنجاب سے جدا کیا تھا اور اس قسم کے ظالمانہ قوانین ہمارے لیے بنائے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ فرنگیوں کے خلاف پٹھانوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ فرنگی انگریز ہمارے دشمن ہیں

اورانہوں نے زور ظلم سے ہمیں اپنا غلام بنالیا ہے۔ انگریزوں کے خلاف پٹھانوں کے اندر ایک پر تشدد تحریک جاری ہوئی تھی۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ پٹھان جہاں بھی انگریز کو دیکھ لیتے تھے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔ اس طرح بہت سے انگریز موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے تھے اور پاداش میں بہت سے پٹھان پھانسی کے تختوں پر لٹکائے جاتے تھے۔ یہ قانون اور یہ صوبہ انگریزوں نے اپنی اس خصوصی غرض اور مطلب کے لیے بنایا تھا کہ وہ انگریز کے خلاف پٹھانوں کی اس تحریک کو علیحدہ طور پر کچل کر رکھ دیں۔

ہمارے وطن میں نام نہاد ملا مولانے اور ''حضرت'' ''بزرگ'' انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے اور لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے سے بدستور منع کرتے رہتے تھے۔ انگریزوں نے ان کے دماغ میں یہ بات بٹھا رکھی تھی کہ پٹھان تعلیم حاصل کرلے گا اور اس میں سوجھ بوجھ پیدا ہو جائے گی تو تمہاری چلی چلائی دکان ٹھنڈی پڑ جائے گی اور پھر تمہیں خیرات اور شکرانے و نذرانے دینا بند کردیں گے میں ان ملاؤں کو بہت سمجھاتا تھا مگر یہ کب سمجھتے تھے۔ میں انہیں کہتا تھا دیکھو اسلام میں علم حاصل کرنا مرد اور عورت کا یکساں فرض ہے۔ یہ اچھا ہے کہ تم اس قوم کو یہ کہتے ہو کہ ان انگریزی مدرسوں میں تعلیم حاصل مت کرو اس حالت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ تم قوم کے بچوں کے لیے اپنے مدرسے جاری کرو اور انہی میں انہیں پڑھاؤ اور اگر تم اپنے قومی مدرسے نہیں بنا سکتے تو پھر اس جہالت سے تو انگریزوں کے بنائے ہوئے مدرسے اچھے ہیں کیونکہ انسان ان میں کچھ نہ کچھ تو سیکھ

ہی لے گا۔

لیکن وہ کسی حالت میں اس بات کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے ایک دن کوہ مری میں تھا گرمی کا موسم تھا۔ ایک ملا صاحب میرے مہمان بنے شام کا وقت تھا ہم سیر کے لیے باہر نکل گئے جب سڑک پر چل رہے تھے اور سیر کر رہے تھے تو چلتے چلتے ایک بنگلے کے پاس پہنچ کر میں نے ملا صاحب سے کہا۔

''ملا صاحب! ذرا اس بنگلے کو تو دیکھیے یہ کیسا بنگلہ ہے؟''

اس نے جواب دیا ''بڑا شاندار بنگلہ ہے اور بہت خوبصورت ہے''۔

میں نے اسے دوبارہ کہا ''اس آدمی کو دیکھیے جس کا یہ بنگلہ ہے اور ان پھولوں کو دیکھیے۔ اچھا جانتے ہیں یہ آدمی کون ہے؟''

ملا صاحب نے جواب دیا ''نہیں میں اسے نہیں پہچانتا''۔

میں نے کہا ''یہ آدمی فرنگیوں (انگریزوں) کا ملا ہے۔ اور یہ بھی دیکھیے کہ اس قوم نے ترقی کی ہے تو اس کے ملا نے بھی ترقی کی ہے اور یہ قوم جو بنگلوں میں رہتی ہے موٹروں میں گھومتی اور سیر کرتی ہے اس کا ملا بھی بنگلے میں رہتا ہے اور موٹروں میں پھرتا ہے اور ہم لوگ جب خود ذلیل وخوار ہیں تو اور ترقی یافتہ نہیں ہیں تو ہمارا ملا بھی ذلیل وخوار ہے۔ اس لیے ملا صاحب! آپ اگر یہ بات ذہن نشین کر لیں اگر ہم لوگوں نے ترقی کر لی تو آپ بھی ترقی یافتہ ہو جائیں گے اور اگر ہمارا حال برا ہے تو آپ سوچیے کہ ہمارے ساتھ آپ کی حالت بھی خراب ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں ہر وقت یہی ٹوکری ہوتی ہے اور گلی کوچوں میں روٹی وظیفے مانگتے پھرتے ہیں۔ اپنی

موجودہ زندگی اور اس انگریز ملا کی زندگی پر کچھ سوچ بچار کیجیے اور دونوں میں فرق سمجھنے کی کوشش کیجیے"۔

ملاؤں کو میرا یہ سمجھانا بیکار رہا۔ کیوں نہ رہتا۔ انہیں جب خدا نہیں سمجھا سکا تو میں کیا سمجھاتا۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

خلق خدا کی خدمت کا آغاز

میں نے مشن اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی ۔ یہ پادریوں یعنی مسیحی مشنریوں کا سکول تھا اور میرے بہت سے ساتھیوں نے اسلامیہ سکول میں تعلیم حاصل کی تھی ۔ میری تعلیم نے میرے دل میں ملک وملت سے پیار ومحبت اور خدمت کا جذبہ پیدا کیا تھا لیکن میرے جو اور ساتھی تھے ان کے دلوں میں نہ تو ملک وقوم سے کوئی محبت تھی اور نہ ہی ان میں خدمت گزاری کا جذبہ تھا۔ میں نے اس مسئلہ پر جس قدر بھی غور و فکر کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے اندر جو حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اس کے لیے تعریف وتوصیف کا حق میرے ان استادوں کو پہنچتا ہے جن سے میں متاثر اور فیض یاب ہوا تھا۔

شاگرد پر استاد کا اثر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ مجھ پر بھی اپنے استاد کا بہت اثر پڑا تھا اور اس سے میرے اندر خلق خدا کی خدمت کرنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ میرا استاد ایک انگریز پادری ایم۔ ای۔ وگرم تھا اور اس کا ایک بھائی ڈاکٹر تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ دونوں بھائی ایک بڑے ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ان دونوں بھائیوں کے باپ نے مشن کے تحت بھیجا تھا اور انہیں تنخواہ بھی باپ اپنی جیب سے دیا کرتا تھا۔ ان میں سے بڑا بھائی مشن سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا اور چھوٹا بھائی مشن ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ یہ دونوں بھائی خلوص ومحبت سے لوگوں کی خدمت کرتے تھے اسے میں دیکھا کرتا تھا۔ کیونکہ میں بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا اس کے قریب ہی ان کا بنگلہ تھا اس زمانے

میں ہمارا بورڈنگ ہاؤس اسی جگہ پر واقع تھا جہاں آج مشن کالج کی عمارت کھڑی ہے ۔ ہمارے یہی ہیڈ ماسٹر ایم ۔ای ۔وگرم صاحب تین چار غریب یا یتیم طلبا کو اپنی تنخواہ سے وظیفے بھی دیا کرتے تھے ۔اس بات نے مجھے بے حد متاثر کیا میں اپنے دن میں کہا کرتا تھا کہ ایک طرف ہمارے ان مسلمان پٹھان بھائیوں کو دیکھیے کہ ان مین اتنی بھی ہمدردی نہیں ہے کہ اپنے کسی غریب بھائی کی کوئی امداد اور خدمت کریں اور دوسری طرف ان کو دیکھیے کہ یہ ایک غری **ملک** کے لوگ ہیں اور غیر قوم اور جدا مذہب رکھتے ہیں لیکن ان لوگوں میں اپنے **ملک** وقوم کے لیے تو کیا غیروں کے لیے بھی کتنی ہمدردی ہے ۔ یہ کتنی دور سے یہاں آئے ہیں اور ہماری خدمت کرتے ہیں ۔مثل مشہور ہے کہ ''خربوزہ را خربوزہ رنگ مے گیسرو'' یہ مثل مجھ پر بھی صادق آتی ہے ۔ان لوگوں کے نیک اوصاف کا مجھ پر گہرا رنگ چڑھ گیا تھا یہی وجہ تھی کہ میں انگلینڈ جا کر انہی قسم کے لوگوں کے درمیان تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہت خواہش مند ہو گیا ۔ لیکن اماں جان سے اجازت نہ پا کر میں نے انگلینڈ جانے کا ارادہ ترک کر دیا ۔تھا کیونک ان دنوں ہمارے لوگ جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے تباہی و بربادی کی طرف جا رہے تھے چنانچہ میں نے اپنی خدمت خلق کا آغاز اپنی پٹھان قوم سے جہالت اور لاعلمی دور کرنے کی کوششوں کے ساتھ کیا۔

میں نے اپنے چند ہم خیال ساتھیوں کو جمع کیا اور ان سے مل کر صلاح ومشورہ شروع کر دیا کہ اپنے وطن میں علم کی روشنی پھیلانے کے لیے کیا اقدام کیے جائیں ۔ خیر ہم نے اس سمت قدم اٹھائے اور خدا کے فضل سے ہمیں حاجی صاحب آف

ترنگ زئی کا تعاون حاصل ہو گیا۔

حاجی صاحب ایک سچے قوم پرست بزرگ تھے۔ان کی سرپرستی میں گدر کے مقام پر ایک دارالعلوم قائم ہو گیا جس کے مہتمم مولوی تاج محمد صاحب مقرر ہوئے۔اور مولوی فضل ربی صاحب اور مولوی فضل محمود مخفی صاحب ان کے ساتھ کام کرنے لگے۔میں نے اور مولوی عبدالعزیز صاحب نے ۱۹۱۰ء میں ایک قومی واسلامی مدرسہ قائم کیا۔

۱۔ حاجی صاحب آف ترنگ زئی کی سرگرمیوں کا آغاز تبلیغی اور اصلاحی مشن سے ہوا تھا۔انہوں نے فضول رسم و رواج بند کرانے اور اسلامی مدرسے قائم کرنے میں بڑی جدوجہد کی اور اس طرح سے پشتون قوم میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ حاجی صاحب کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے انگریز حکومت کو بدحواس کر دیا اور وہ بوکھلا اٹھی۔سرکار نے آپ کو گرفتار کر لیا ان کے عقیدت مندوں کا جوش وخروش دیکھ کر حکومت گھبرا گئی اور حاجی صاحب کو رہا کر دیا گیا۔حاجی صاحب نے انگریزی حکومت کو ختم کرنے کے لیے نئے علاقہ میں ہجرت کر لی اور زندگی کے آخری دور تک انگریزی حکومت کے خلاف برسرپیکار رہے۔انہی کے متعلق انگریز نے کہا تھا ''حاجی صاحب ترنگ زئی کا ہمارے ہاتھ سے نکل جانا ہندوستان میں ہماری سب سے بڑی ناکامی ہے''۔

اسی طرح صوبہ بھر میں ہماری کوششوں سے بہت سے مدرسے کھل گئے اور بہت

سے طلباان میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ لوگوں میں تعلیم کا شوق پیدا ہو گیا اس زمانہ میں ظفر علی خان کے اخبار ''زمیندار'' اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' اور ''مدینہ'' کو دنیائے صحافت میں بڑی شہرت حاصل تھی اور انہیں ہم بھی منگوایا کرتے تھے ان اخبارات کو جہاں ہم خود بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے وہاں دوسرے لوگوں کو بھی سنایا کرتے تھے۔ کیونکہ ان دنوں لوگوں میں اخبار پڑھنے کا شوق نہیں تھا لیکن ہمارے پڑھ کر سنانے سے لوگوں میں اخبار بینی کا شوق پیدا ہو گیا اور جو لوگ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' منگوایا کرتے تھے ان کے نام پولیس اور سی۔آئی۔ڈی اپنے پاس درج کر لیتی تھی اور وہ آدمی مشتبہ سمجھے جاتے تھے۔

ہمارے صوبہ کے بعض طلبا دیوبند میں تحصیل علم کے لیے گئے تھے اور دیوبندیوں کے ساتھ ہمارے مولوی فضل ربی اور مولوی فضل محمود مخفی کے گہرے تعلقات تھے۔ مولوی فضل ربی نے دیوبند میں تعلیم حاصل کی تھی اس لیے ہم بھی کبھی کبھار دیوبند جایا کرتے تھے۔ دیوبند کے تعلیمی ادارہ کے صدر شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب جہاں بہت بڑے عالم تھے وہاں نیک خصالی اور پاکبازی میں اپنی مثال آپ تھے ان سے بھی ہمارے تعلقات پیدا ہو گئے کیونکہ ان کے دل میں ملک وملت کے لیے ہمدردی ومحبت تھی اور ہم بھی اسی مرض میں مبتلا تھے۔ وہ بھی اسی فکر میں تھے کہ یہ ملک فرنگی کی غلامی سے کیسے نجات حاصل کرے گا۔ اور ہم بھی انہی تفکرات میں مبتلا تھے۔ انہیں کے ذریعہ مولانا عبیداللہ سندھی سے بھی ہماری ملاقات ہوگئی اور ہم ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہو گئے۔ مولانا صاحب ان دنوں پوری میں انگریز

تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن شریف کا درس دیا کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے بے خبر ہے اور اگر یہ لوگ مذہب سے باخبر و واقف ہو جائیں تو پھر ان میں ملک وملت سے محبت' عقیدت اور خدمت کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ مولانا صاحب نے اس سلسلے میں بڑے ایثار و محنت کا ثبوت دیا لیکن وہ اپنے خیال میں کامیاب نہ ہو سکے اور سب سے زیادہ رنجیدہ بات یہ ہوئی کہ مولانا صاحب کا ایک بہت بڑا شاگرد تھا جس کی تربیت پر انہوں نے بے حد محنت و مشقت کی تھی اور اپنا بڑا وقت لگایا تھا' وہی مخبر یعنی جاسوس نکلا وہ چند ٹکوں کی خاطر تمام باتیں حکومت تک پہنچا دیا کرتا تھا۔ اب غور کیجیے جس قوم کے تعلیم یافتہ لوگوں کی زر پرستی اور حرص و آز کا یہ عالم ہو کہ چند ٹھیکروں کے لیے اپنے ملک وملت کو بیچنے پر تل جائیں ان میں ملک اور قوم کی محبت اور خدمت کا جذبہ کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔

مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان کو دولت سے پیار ہو گیا اور جب یہ چیز ان میں پیدا ہو گئی تو یہ لوگ خدا پرستی چھوڑ کر زر پرست بن گئے اور دنیا میں ذلیل و خوار ہو گئے۔ فتح پوری میں مولوی سیف الرحمٰن سے بھی شرف ملاقات حاصل ہونے کے بعد ان سے اچھی جان پہچان ہو گئی تھی۔ وہ ہمارے علاقے کے رہنے والے تھے لیکن عرصہ دراز سے فتح پوری کے عربی مدرسے کے مدرس تھے۔ اس زمانہ میں انگریزوں نے لوگوں کے دلوں میں انتہائی ڈر پیدا کر دیا تھا۔ اور لوگ حکومت کے سخت مخالف ہو گئے تھے ہم لوگ چھپ چھپ کر کبھی کبھار صلاح و مشورہ کے لیے دیو بند جایا کرتے تھے۔

۱۹۱۲ء میں ماں باپ نے میری شادی کردی اور ۱۹۱۳ء میں میرے یہاں بیٹا غنی پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں ہمارے صوبہ میں جلسہ جلوس کی بات کوئی نہیں جانتا تھا اور اگر کوئی ان کا خیال بھی دل میں لاتا تو وہ ڈر کے مارے ان کا اہتمام نہ کرپاتا۔ ۱۹۱۳ء کے اخبارات میں ہم نے بڑے بڑے مضامین اور اعلانات دیکھے کہ آگرہ میں مسلم لیگ کا ایک بہت بڑا سالانہ اجتماع ہوگا اور اس کے صدر سر ابراہیم رحمت اللہ ہوں گے۔ اور اس جلسہ میں سر آغا خان اور مولانا عبدالکلام آزاد بھی شریک ہوں گے۔ ہمارے دل میں بھی اس جلسہ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا اور میرے ساتھی آگرہ روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر مسلم لیگ ک جلسہ میں شامل ہوئے۔ مسلم لیگ کے صدر کا خطبہ ہم نے سنا اور سر آغا خان اور مولانا عبدالکلام آزاد اور بہت سے دوسرے مقررین کی تقاریر سنیں جلسہ بہت عظیم الشان تھا اور ہم نے اس میں شریک ہوکر بہت کچھ سیکھا اور سمجھا۔ اختتام جلسہ کے بعد ہم واپس چلے آئے۔ آگرہ سے دہلی پہنچے وہاں مولوی فضل الرحمٰن کے بھتیجے کے ساتھ میں نے چند دن دہلی میں گزارے اس اثناء میں میں بیمار ہوگیا اور ہم دہلی سے اپنے گاؤں لوٹ آئے۔

ا۔ مولانا عبید اللہ سندھی عظیم انقلابی رہنما تھے انگریزی دور میں ان کا زیادہ تر وقت غیر ممالک کی انقلابی قوتوں کو منظم کرنے میں گزرا۔ میں نے انہیں زندگی کے آخری دور میں دیکھا تھا۔ بڑھاپے کے باوجود ان کے جذبات جوان تھے۔

شیخ الہند سے ملاقات

۱۹۱۴ء میں شیخ الہند صاحب کا ایک خط مجھے ملا اس میں لکھا تھا کہ خط دیکھتے ہی میں دیو بند چلا آؤں ۔ میں مولوی فضل محمود صاحب اور فضل ربی صاحب روانہ ہو گئے ۔ جب ہم دیو بند پہنچے تو وہاں دیگر کئی مولوی بھی ہمارا انتظار کر رہے تھے ۔ بحث اس بات پر جاری تھی کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے صوبہ سرحد آزاد علاقہ میں ایک مرکز ہونا چاہیے ۔ جہاں ملک کی آزادی کی خاطر انگریزوں کے مقابلہ کے لیے ایک خاص انتظام کیا جائے اور جدوجہد شروع کی جائے ۔

اس سے پہلے ہندوستان کی اس جماعت کا خیال یہ تھا کہ بونیر کے علاقہ میں مجاہدین کا جو مرکز ہے وہ شاید ایک بڑی طاقت کا حامل ہے ۔ لیک درحقیقت اس بارے میں ہندوستان کے لوگوں کو غلط فہمی میں رکھا گیا تھا ۔ وہ مرکز کوئی بڑی طاقت نہیں تھا ۔ اور اس مرکز کے لوگ اتنے بیکار تھے کہ اس آزاد علاقہ میں جو لوگ ان کے اردگرد اڑوس پڑوس میں رہتے تھے ان سے بھی انہوں نے کوئی رابطہ پیدا کیا تھا اور نہ ہی انہوں نے ان میں کوئی تبلیغ یا کام کیا تھا ۔

ان لوگوں کی ایک نہایت مختصر سی جماعت تھی جسے ہندوستان سے روپے ملا کرتے تھے ۔ اور وہ مزے اڑایا کرتے تھے ۔ ان کا کوئی کام دھندا نہ تھا ۔ تیار خود تھے ان کا ایک امیر تھا جس کا نام نعمت اللہ تھا ۔ وہ ہمارے صوبہ سرحد کا باشندہ تھا اس کی ہمارے صوبہ کے خفیہ پولیس کے بڑے افسر شارٹ سے سازباز تھی ۔ ان میں بعض

لوگ جاسوس تھے مجاہدین کی یہ جماعت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو سکھوں کے مقابلے کے لیے سید احمد صاحب اور سید اسماعیل صاحب شہید کے ہمراہ ہندوستان کے شہر بریلی میں آئے تھے اور جب سید احمد صاحب اور اسماعیل صاحب شہید ہزارہ میں سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تو ان کے یہ باقی ساتھی بونیر کے اس آزاد علاقہ میں آ گئے اور یہاں آباد ہو گئے جب ان لوگوں کی حقیقت ہندوستان کے لوگوں کو معلوم ہو گئی اور یہ جان گئے کہ یہ فضول لوگ ہیں تو شیخ الہند کی جماعت کو ایک نیا مرکز قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بہت بحث مباحثوں کے بعد فیصلہ اس بات پر ہوا کہ میں اور فضل محمود صاحب باجوڑ کی ان آزاد قوموں میں چلے جائیں اور وہاں ایک محفوظ جگہ مرکز کے لیے منتخب کریں۔ کچھ دنوں کے بعد اس مرکز کے ملاحظہ کے لیے مولوی عبیداللہ سندھی صاحب جائیں۔

اس فیصلہ کے بعد ہم لوگ واپس اپنے گاؤں میں آ گئے اور کچھ دنوں کے بعد میں اور مولوی فضل محمود صاحب خفیہ طور پر باجوڑ چلے گئے۔ تخت بھائی سے ہم لوگ ریل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اور درگئی سٹیشن پر ریل سے اتر پڑے اور اس جگہ سے ہم ٹم ٹم میں سوار ہو کر جب مالاکنڈ کے دروازے پر پہنچے تو ہمیں بڑی فکر لاحق ہوئی تھی کیونکہ اس جگہ پولیس چوکی بیٹھی ہوئی تھی اور وہاں ہر ایک شخص کی چاہے وہ پیادہ ہوتا یا سوار تلاشی لی جاتی تھی۔ چھان بین اور پوچھ تاچھ کے بعد اگر کسی پر ذرا شک ہوتا تو اسے پکڑ لیا جاتا تھا۔ میری شکل وصورت اور قد و قامت چھپانے کا نہیں تھا۔ اس لیے مجھے سب سے زیادہ فکر تھی کہ میں کیسے اس چوکی سے گزروں گا۔ میں ٹم ٹم میں

پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور میں نے جب اپنے جسم کے ارد گرد پورے طور پر چادر اوڑھ رکھی تھی۔

پولیس چوکی پہنچ کر ہماری ٹم ٹم کھڑی ہوگئی اور ہمیں دیکھنے کے لیے ایک سپاہی آ گیا۔ یہ شام کا وقت تھا میرے دوسرے ساتھی ٹم ٹم سے اتر پڑے اور میں گٹھری سی بنا بیٹھا رہا۔ ہماری ٹم ٹم والا بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے سپاہی سے کہہ دیا کہ صاحب کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ سپاہی قریب آیا میرے نیچے اوپر نظر دوڑائی اور کہہ دیا کہ جا سکتے ہو۔ میں بڑا خوش ہوا کہ ایک بہت بڑی بلا سے نجات ملی۔

ہم بٹ خیل پہنچ کر ٹم ٹم سے اتر پڑے وقت بہت گزر چکا تھا ہم نے وہیں رات گزاری صبح سویرے ملا کی بانگ کے وقت اس جگہ سے روانہ ہوئے۔ چکدرے کے پل کو پار کر رہے تھے کہ یہاں بھی سپاہی کھڑے تھے لیکن ان سے بھی بخیر و خوبی گزر گئے۔ سارا دن پاپیادہ چلتے رہے شام کو دریا کے کنارے پہنچے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر مولوی فضل محمود صاحب کا گاؤں تھا سردی کا موسم تھا دریا میں پانی کم تھا ہم نے دریا کو پار کر لیا۔ دن کے بہت تھکے ہوئے تھے اور بھوکے تھے کھانا کھانے کے بعد سو گئے کیونکہ ہم بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے گاؤں میں ایک رات آرام کیا اور دوسرے روز فضل محمود صاحب خود تو مولوی عبید اللہ سندھی کے لیے یہاں رک گئے اور میرے ہمراہ اپنا خالہ زاد بھائی بھیج دیا۔ میں اور وہ اس جگہ سے باجوڑ کو روانہ ہو گئے یہ دیر کا علاقہ تھا ہم اس جگہ سے بابڑہ چلے گئے۔

چمر کنڈ میں ہڈہ کے ملا صاحب کے پاس پہنچ گئے وہ خود تو رحلت فرما چکے تھے لیکن

ان کے ایک شیخ وہاں موجود تھے ۔ بہت اچھے انسان تھے اور اس جگہ بھی پہاڑ کے اوپر تھوڑی سی جگہ تھی لیکن وہ بہت خوبصورت تھی شیخ صاحب نے اڈے صاحب کا وہ خلوت خانہ اور لنگر خانہ دکھایا اس جگہ اور کوئی بھی نہیں تھا صرف شیخ صاحب کا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ شیخ صاحب نے اپنے گھر میں شہد کی مکھیاں بھی پال رکھی تھیں اور اسی دھندے دے ان کا گزر بسر ہوتا تھا۔ ہم نے شیخ صاحب کے پاس رات گزاری۔ صبح ہم ان سے رخصت ہوئے اور کوٹکی پہنچ گئے ۔ کوٹکی کے خوانین' زغر اور خان اور زڑہ ور خان بہت بھلے خان خیل تھے اور انگریز جہاں بھی قبائل پر چھاپے مارتے تھے یہ لوگ انگریزوں کے خلاف ہر جنگ میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس جگہ سے پھر سالر دزیوں میں آ گئے اور وہاں سے مامندوں میں چلے گئے ۔ یہ دونوں قومیں باجوڑ کی آزاد قومیں تھیں اور بہت اچھے پختون تھے۔ پختونوں کی دیگر اقوام و قبائل کی طرح فرنگیوں کے زیر اثر نہ تھے اور نہ ہی ان سے پیسے یا مواجب لیا کرتے تھے ۔ بلکہ جہاں کہیں بھی انگریزوں سے جنگ ہوتی یہ اس میں شریک ہوتے تھے

ہم نے شنگر گل ۔ گبرے' کٹ وکٹ اور اسی طرح کچھ اور گاؤں میں بھی راتیں گزاریں ۔ اور یہ سارا علاقہ گاؤں بہ گاؤں ہم نے دیکھا اور مرکز کے لیے ہم نے مامندوں کے علاقہ میں گئے نام کا گاؤں پسند تھا۔ یہاں ہم مولوی عبید اللہ صاحب سندھی کے انتظار میں تھے ۔ ایک دو دن جب انتظار کر چکے تو وہ نہ آئے تو ہم نے یہ خیال کیا کہ ایسا نہ ہو کہیں لوگوں کو ہم پر کسی قسم کا شک پیدا ہو جائے میں نے ایک چلہ کاٹنے کا فیصلہ کیا مسجد میں ڈیرا لگا رکھا تھا اس مسجد میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی ۔

میں نے اسی میں چلہ شروع کر دیا جب چلہ گزر جانے پر بھی عبید اللہ صاحب سندھی نہ آئے تو ہم اس جگہ سے چل پڑے ۔ مالا کنڈ تک تو فضل محمود صاحب کا وہ خالہ زاد بھائی میرے ساتھ رہا اور مالا کنڈ سے میں نے اسے رخصت کر دیا ۔

مالا کنڈ کے ایک پولیٹکل ایجنٹ نے وہاں کے لوگوں پر ایسی دہشت بٹھا رکھی تھی کہ ان کے بڑے بڑے آدمی بھی جب کسی انگریز کو دیکھ لیتے تھے تو ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور بہت دور سے اس کے آگے جھک جاتے تھے اور بڑے ادب سے اسے سلام کرتے تھے ۔ اس کی وجہ ایک یہ تھی کہ اگر کوئی آدمی انگریز کے سامنے آجاتا اور وہ انگریز کو سلام نہ کرتا تو اسے گرفتار کر لیا جاتا اور اسے ''کاٹھ'' میں ڈال دیا جاتا تھا کاٹھ ایک بڑی بھاری وزنی اور لمبی لکڑی ہوتی تھی ۔ اس میں سوراخ ہوا کرتے تھے ۔ ان سوراخوں کے اندر آدمی کے پاؤں دبا دیے جاتے تھے اور اوپر سے لکڑی کے ڈھکنے کو ٹھوک ٹھوک کر بند کر دیا جاتا تھا ۔ اس طرح آدمی اس میں بندھا ہوا پڑا رہتا تھا میں بھی ڈرتا ڈرتا مالا کنڈ سے درگئی کی طرف نیچے اتر آیا اور درگئی پہنچ کر ریل گاڑی کے اندر بیٹھ گیا اور تخت بائی چلا گیا ۔ تخت بائی سے میں اپنے زراعتی فارم یعنی مہمند ناڑی کے گاؤں میں آ گیا ۔ وہاں میں نے رات گزاری اور دوسرے دن اپنے آبائی گاؤں اتمان زئی چلا آیا ۔

دوسرے دن صبح بہت سے لوگ مجھے خوش آمدید کہنے آئے ۔ کیونکہ جاتے وقت میں نے یہ بات مشتہر کر دی تھی کہ میں اجمیر شریف جا رہا ہوں تھوڑے دنوں کے بعد یورپ کی جنگ عظیم اول شروع ہو گئی اور مرکز قائم کرنے کی ہماری سکیم اسی جگہ رہ

گئی۔ پھر اس کے بعد ہمیں ایک دوسرے کا کوئی حال احوال معلوم نہیں ہوا شیخ الہند محمود الحسن صاحب حج معلی کے لیے مکہ شریف چلے گئے۔ انہیں مکہ میں شریف مکہ نے پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے انہیں مالٹا میں قید کر دیا۔ کیونکہ وہ ترکوں کی خلافت کے حق میں تھے۔ مولوی عبید اللہ صاحب سندھی افغانستان چلے گئے اور مولوی سیف الرحمن صاحب سرحد کی طرف واپس آ گئے اور حاجی صاحب ترنگ زئی سے ملے اور اس جگہ سے ہجرت کر کے بونیر کے آزاد علاقہ میں چلے گئے۔

حاجی صاحب کے ہمراہ میرے کارگزار ساتھی مولوی راج محمد صاحب جو گدر دارالعلوم کے مہتمم تھے فضل ربی صاحب' مولوی فضل محمود صاحب اور مولوی عبد العزیز صاحب بھی ہجرت کر کے چلے گئے۔ کچھ دن کے بعد میں بھی لک چھپ کر ان کے پیچھے بونیر چلا گیا۔ بونیر کے لوگوں نے حاجی صاحب ترنگ زئی کو ایک بہت بلند سطح اور خوبصورت جگہ دے رکھی تھی اور اس کی تعمیر کے لیے بہت سی عمارتی لکڑی بھی لیے آئے تھے۔ لیکن اس علاقہ کے جو میاں' ملا اور مذہبی بزرگ تھے وہ حاجی صاحب کی آمد سے خوش نہیں تھے کیونکہ ان کی آمد سے لوگوں کی تمام تر توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی تھی اور ان کے مقابلہ میں مقامی نام نہاد دینی رہنماؤں کی کوئی وقعت نہیں رہی تھی' اس لیے ان لوگوں نے حاجی صاحب کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دہیا۔ یہاں جہاد کے لیے آئے ہیں یا جائیداد کے واسطے؟

اس پراپیگنڈے سے حاجی صاحب اور ان کے فرزند بادشاہ گل بڑے متاثر

ہوئے تھے اور جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے میں نے تو ان کے اس ارادے کی بری سخت مخالفت کی اور انہیں سمجھایا کہ "یہ خود غرض لوگ ہیں ان کی باتوں کے پیچھے مت جایئے۔ آپ لوگ اپنا کام کرتے رہیں یہ قوم انگریزون کے مقابلے کے قابل نہیں ہے اور اگر آپ لوگوں نے انگریزوں سے جنگ شروع کر دی تو یہ لوگ جنگ کے نا قابل ہو جانے کی وجہ سے مفید ثابت نہیں ہوں گے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ آپ لوگوں کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیں گے۔ لیکن میرا مشورہ انہیں اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکا۔ اور جب میں یہاں سے واپس چلا آیا تو چند دن بعد انہوں نے انگریزوں سے لڑائی شروع کر دی بونیری انگریزوں سے جنگ کہاں کر سکتے تھے اور ٹھیک وہی کچھ ہوا جو میں نے انہیں کہا تھا۔

بونیر کے لوگوں نے حاجی صاحب کو پکڑنے کی کوشش کی تاکہ انہیں پکڑ کر انگریزوں کے سپرد کر دیں لیکن حاجی صاحب کو اس سازش کا علم ہو گیا اور وہ رات ہی رات وہاں سے نکل کر مہمندوں کے قبیلے میں پہنچ گئے لیکن انگریزوں نے اس سے بھی ایک ناجائز فائدہ اٹھالیا۔ کیونکہ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ پٹھانوں کے بچے تعلیم کے زیور سے مرصع ہوں انہیں تو ہمارے یہ قومی مدرسے سخت ناپسند تھے۔ انگریز ان مدرسوں کو اپنے لیے ضرر رساں سمجھتے تھے چنانچہ حاجی صاحب ترنگ زئی کی انگریزوں کے خلاف نبرد آزمائی نے انگریزوں کے لیے یہ موقع اور بہانہ پیدا کر دیا کہ وہ ہمارے ہاں کے تمام قومی مدرسے بند کر دیں۔ انہوں نے یہ مدرسے تو بند کر ہی دیے اور ساتھ ہی ان کے تمام استادوں کو گرفتار کر کے ڈیرہ اسماعیل خان کے

عادی مجرموں کے لیے مخصوص جیل میں ڈال دیا۔ انگریزوں نے ہمارے لوگوں پر ایسا خوف و ہراس طاری کر دیا کہ کوئی بھی محض قوم کا نام لینے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اور اگر شاذونادر کوئی ایسی بات منہ سے نکالتا بھی تو اسے جیل خانے میں ٹھونس دیا جاتا۔

ا۔ مولوی عبدالعزیز انتہائی طور پر انگریز دشمن تھے یہاں تک کہ وہ کسی انگریز کو دیکھتے تو آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ مولانا انگریزوں کی سازش سے قلعہ سوات میں قتل کر دیے گئے۔

☆☆☆

CyberLibrary All rights reserved. ©2002-2006

ولی خان کی پیدائش

دسمبر ۱۹۱۵ء میں میرا لڑکا ولی پیدا ہوا۔ غنی اس وقت لگ بھگ تین برس کا تھا۔ پھر جب پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد ہندوستان بھر کو انفلوئنزا کی نامراد بیماری نے لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ان کے بچوں کی ماں کو بھی اس بیماری نے آن دبوچا اور وہ جہان فانی سے رخصت ہوگئی۔ اس کی وفات ایک عجیب وغریب واقعہ تھا خدا کی قدرت کا ایک غیر معمولی کرشمہ دیکھنے میں آیا۔ وہ بالکل بھلی چنگی تھی لیکن بیٹا غنی انفلوئنزا میں مبتلا تھا اور بے ہوش پڑا تھا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ شام کا وقت تھا مصلے پر بیٹھا ہوا تھا عصر شام کی نماز میں نے ادا کر لی تھی اور دعا مانگ رہا تھا قریب المرگ غنی کی چارپائی میرے سامنے پڑی تھی۔ اس اثناء میں اس کی ماں آ گئی اور اس کی چارپائی کے چاروں طرف گھومی اور اس کے سر کی طرف آ کھڑی ہوئی پھر اس نے دعا کے لیے ہاتھ اوپر اٹھا لیے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے وہ خدا سے عاجزانہ لہجہ میں کہہ رہی تھی کہ اے خدا اس معصوم کی تکلیف اور بیماری مجھے منتقل کر دے اور اسے تندرست کر دے یا خدا اس کی بیماری مجھے لگا دے''۔

خدا کی قدرت دیکھیے کہ جونہی رات گزری اور صبح ہوئی تو غنی آہستہ آہستہ اچھا ہونے لگا اور اس کی ماں آہستہ آہستہ بیمار پڑنے لگی انجام کار غنی صحت یاب ہو گیا اور اس کی ماں جاں بحق ہوگئی۔

پشاور جیل میں

۱۹۱۸ء میں جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوگئی تو لوگوں نے تھوڑا سکھ کا سانس لینا شروع کیا۔لیکن جلد ہی ایک نیا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ہندوستان کے عوام آس لگا بیٹھے تھے کہ جنگ عظیم میں ہندوستانی جوانوں کی قربانیوں اور خدمات کے صلہ میں انہیں کچھ نہ کچھ حقوق آزادی یا سیاسی مراعات فراواں کر دیے جائیں گے۔لیکن بسائے آرزو کہ خاک شد‘ مراعات کے بدلے ۱۹۱۹ء کا رولٹ ایکٹ سا ایک کالا قانون بصورت تلوار گردنوں پر آویزاں کر دیا گیا۔پھر کیا تھا ہندوستان میں غصے کی ایک لہر دوڑ گئی اس ایکٹ کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن شروع ہوگئی اہم اس تحریک میں کود پڑے اس ایکٹ کے خلاف جب ہم نے دوسرا جلسہ منعقد کیا تو لوگوں میں اس قدر جوش تھا کہ جلسہ میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ شامل ہوئے۔انہی جلسوں کے ذریعے پٹھانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہوئی۔ایک دن تہکال اسلامیہ کالج پشاور کے قریب ایک گاؤں میں جلسہ ہونے والا تھا ہم اس جلسے میں شامل ہونے کے لیے جا رہے تھے کہ راستے میں ہمیں پتا چلا کہ مارشل لاء جاری ہوگیا ہے۔اس وقت افغانستان اور انگریزوں میں بھی جھگڑا شروع ہو چکا تھا ہم چند ساتھیون نے مارشل لاء سے محفوظ رہنے کے لیے افغانستان جانے کا ارادہ کیا ہم نے سوچا کہ پہلے ہم مہمندوں میں چلے جائیں گے اور پھر اس جگہ سے افغانستان چلے جائیں گے لیکن ہم بمشکل مہمندون کے علاقے میں ہی پہنچے تھے کہ میرے پیچھے میرے والد صاحب آ

گئے اور انہوں نے ہمیں افغانستان جانے سے منع کر دیا۔ وہ ہمیں اپنے زرعی فارم مہمند ناڑی لے آئے۔ وہاں ہم حکومت کے ڈر کے مارے کہیں چھپے رہتے تھے اور رات کو گھر آتے تھے۔

آخر پولیس کو ہمارا پتہ لگ گیا وہ آ گئی اور مجھے گرفتار کر لیا اور میرے مردان لیجا کر جیل میں ڈال دیا۔ دوسرے دن مجھے پولیس کپتان کے سامنے پیش کیا گیا اس نے حکم دے دیا کہ مجھے بیڑیاں پہنا دی جائیں۔ مجھے پھر جیل خانے سے لیجایا گیا لیکن سارے جیل خانے میں میرے پاؤں کے ماپ کی بیڑیاں نہ ملیں کیونکہ اس زمانہ میں میری صحت بہت اچھی تھی اور میں بڑا مضبوط و توانا تھا۔ تب انگریز کے ڈر سے مارے جیل والوں نے میرے پاؤں میں ایسی بیڑیاں ڈال دیں جو میرے پاؤں میں بڑے عذاب سے آتی تھیں۔ مجھے موٹر میں بٹھا دیا گیا اور میرے ساتھ اسی موٹر میں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مردان کے اسسٹنٹ کمشنر بھی بیٹھ گئے۔ وہ مجھے پشاور لے گ ءاور وہاں مجھے بڑے کپتان کے سامنے پیش کیا پھر مجھے چھاؤنی کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔ جس وقت پولیس مجھے حوالات کی طرف لے جا رہی تھی۔ تو وہ بیڑیاں جو زبردستی میرے پاؤں میں پہنا دی گئی تھیں میرے پاؤں کو ریتنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے پاؤں خون بہنے سے لت پت ہو گئے اور ان کی جلد بالکل ادھڑ گئی۔ دوسرے دن میرے پاس ایک پولیس انسپکٹر آیا وہ ایک آفریدی پشتون تھا اس نے مجھ سے کہا ''باہر نکل جاؤ تمہاری تاریخ پیشی ہے''۔

میں نے اسے جواب دیا ''اجی میرے تو پاؤں بالکل زخمی ہیں اور میں پیدل نہیں

جا سکتا۔

پولیس انسپکٹر بگڑ کر مجھ سے کہنے لگا۔ ''جلسے تو کر سکتے ہو لیکن پیشی کے لیے عدالت تک نہیں جا سکتے''۔

میں نے اس کے ساتھ بحث میں پڑنا مناسب نہیں سمجھا لہٰذا میں نے اسے صرف اتنی بات کہہ دی۔ ''میں پیدل چلنے کے قابل نہیں ہوں اگر تم ٹم ٹم لے آؤ تو چلا چلوں گا اور اگر ٹم ٹم نہیں لاؤ گے تو نہیں جاؤں گا''۔

پولیس انسپکٹر ٹم ٹم لے آیا اور اس میں مجھے بٹھا کر عدالت میں لے گیا مجھے کمرہ عدالت سے باہر بٹھا دیا گیا اور مجھ سے پہلے ایک اور قیدی کو عدالت کے سامنے پیش کیا گیا وہ قیدی ہمارے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس نے تار کاٹا تھا اور اس جرم میں دو سال کے لیے قید تھا۔ اسے آج پھر عدالت میں کیوں پیش کیا گیا تھا۔ اس بات کا راز اس وقت کھلا جب پیشی کے بعد اس آدمی کو میں نے جیل خانے میں دیکھا اور اس نے مجھے بتایا کہ اس کو اس غرض کے لیے اس فوجی عدالت میں لے جایا گیا تھا کہ وہ اس امر کی شہادت دے گا کہ اس نے تار کاٹنے کا جرم عبدالغفار خان کی ہدایت پر کیا تھا اسے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اگر وہ ایسی شہادت دے دے گا تو اس کو دو سال کی قید معاف کر دی جائے گی۔ لیکن اس آدمی نے ایسی شہادت دینے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد مجھے پیش کیا گیا تب ایک کی بجائے تین انگریز عدالت کے باہر بیٹھے ہوئے تھے وہ مجھ پر کئی طرح کے سوالات کرنے لگے میں کیا جواب دیتا ہم نے

تو جلسوں میں کچھ کہا نہیں تھا صرف قراردادیں منظور کی تھیں۔

ایک انگریز نے مجھ پر سوال کیا "کیا تم حکومت کے خلاف لوگوں میں گھوما پھرا کرتے تھے؟"

میں نے اسے جواب دیا "جن لوگوں کے پیچھے میں پھرتا ہوں وہ سب تمہارے قوانین و ملکان یا چپقلش ہیں اور سرکار کے وفادار ہیں"

سوالات کے بعد انہوں نے پھر مجھے باہر بھیج دیا باہر کچھ وقت تک بٹھایا گیا کیونکہ اندر وہ میرے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ان دنوں ہمارے علاقے کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل تھے۔ انہیں پٹھان بہت پسند تھے اور ان کے ساتھ ہمدردی بھی رکھتے تھے۔ چونکہ مارشل لاء کے سب سے بڑے افسر وہ خود ہی تھے اور تمام اختیارات انہی کے ہاتھ میں تھے۔ اس لیے وہ کسی کو زور ظلم کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ایک گھنٹے کے بعد سپاہی مجھے جیل خانے میں لے آئے اور مجھے ایک ایسی بیرک میں بند کر دیا گیا جس میں بہت سے کابلی پٹھان بھی مقید تھے۔ کچھ دنوں ک بعد اچانک میرے ضعیف العمر والد صاحب اپنے لواحقین اور اس جگہ کے چند ساتھیوں کو لے کر وہاں آ گئے۔ ابا جان نے جونہی مجھے دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئے کیونکہ ادہر یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ مجھے پھانسی دے دی گئی ہے اور میں یہاں زندہ تھا۔

انہوں نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ ادھر فوج گئی تھی اور اس نے اتمان زئی گاؤں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگوں کو مدرسے کے میدان میں جمع کر لیا گیا تھا

فوج کے ساتھ توپیں بھی تھیں جب اس نے گاؤں کے لوگوں کو اس طرح ایک جگہ بٹھا دیا تو توپوں کے منہ ان کی طرف پھیر دیے گئے اور گورے توپچی توپوں کے اوپر چڑھ گئے تھے اور توپوں سے ایسی آواز پیدا کرنے لگے تھے جو ان کے داغنے کے پہلے پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کو ایسا لگا کہ انہیں توپوں سے اڑا دیا جائے گا۔ انہوں نے درود و قرآن کی آیتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ لیکن توپوں سے گولے برسے تھے اور نہ ہی بندوقوں سے گولیاں چلی تھیں بلکہ خیر و عافیت سے آئی بلا سر سے ٹل گئی تھی۔ لیکن اس سے لوگوں میں زبردست خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ڈر کا یہ عالم تھا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے محشر کا منظر گھومنے لگا تھا خیر زندگیاں تو ان کی بچ گئیں تھیں لیکن ان فوجیوں نے گاؤں میں لوٹ مار کرنے سے دریغ نہ کیا تھا ہمارے گھر سے ایک انگریز خود ایک شکاری بندوق اٹھا کر لے گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے ہمارے گاؤں کے لوگوں پر تیس ہزار روپے اجتماعی جرمانہ کیا لیکن پولیس اور خان بہادر عمر خان نے زور ظلم کے ذریعے سے گاؤں سے تیس ہزار روپے کی بجائے ایک لاکھ سے بھی زیادہ روپیہ لوگوں سے وصول کیا۔ ایک سو پچاس آدمی گرفتار شدگان میں سے ایک سو آدمیوں کو یرغمال قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ جب جرمانہ وصول ہو جائے گا تب یہ رہا کر دیے جائیں گے۔

اس وقت پولیس نے تو بے حد کوشش کی تھی اور بعد میں بھی کرتی رہی کہ ہمیں افغانستان کی شورش سے وابستہ کر دے اور اس نے ہم میں سے ایک آدمی کو جس کا نام احمد استاد تھا سرکاری گواہ بن جانے کے لیے تیار بھی کر لیا تھا۔ لیکن پولیس اپنے

مقصد میں کامیاب نہ ہوئی کیونکہ سرحد کا چیف کمشنر روس کیپل صاحب ہمارے خلاف مقدمہ نہیں چلانا چاہتا تھا۔ تاہم ہمارے گاؤں کے اکثر خوانین کو جیل خانے بھیج دیا گیا تھا لیکن ایک خان جس کا نام محمد عمر خاں تھا وہ انگریزوں یعنی حکومت کا ایسا پٹھو تھا کہ اس نے پولیس کے ساتھ سازباز کرکے لوگوں پر بہت زیادتیاں کیں اور ان پر مظالم توڑے اور لوگوں سے تین تین مرتبہ جرمانہ وصول کیا جب جرمانہ ادا ہو گیا تو وہ ایک سو آدمی رہا کر دیے گئے اور ساڑھے تین مہینے کے بعد وہ دوسرے قیدی چھوڑ دیے گئے جو گاؤں پر چڑھائی کے وقت پکڑ لیے گئے تھے۔ صرف میں ہی اکیلا رہ گیا تھا لیکن چھ ماہ کے بعد مجھے بھی رہا کر دیا گیا۔ مصائب اور تکالیف تو ہم نے برداشت کر لیں، لیکن اس سے ہماری قوم کو ایک بہت بڑا فائدہ پہنچا اور وہ یہ کہ اس کی وجہ سے پٹھانوں میں سیاسی زندگی کی ابتدا ہو گئی۔

☆☆☆

جیل سے رہائی اور دوبارہ گرفتاری

میں نے اپنی زندگی میں اس وقت تک دو مارشل لا دیکھے ہیں۔ایک ۱۹۱۹ء میں انگریزوں کے زمانے میں دوسرا پاکستان بن جانے کے بعد ۱۹۵۸ء میں یہ دونوں مارشل لاءمیری طف سے خواہ مخواہ ایک مختصر اشارہ کر دیے جانے کے حاجت مند ہیں تا کہ دونوں حکومتوں کے طرزِ عمل کا موازنہ کیا جا سکے۔

انگریزوں نے جب مارشل لاء لگایا تھا تو اس وقت ایک طرف تو افغانستان سے ان کی جنگ جاری تھی اور دوسری طرف ہنگاموں اور تشدد کی کارروائیوں نے اتنا زور پکڑ لیا تھا کہ انگریز نے ملک میں امن وامان کے قیام اور اپنی حکومت کے ڈھانچے کو بحال رکھنے کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ دیکھا تھا انہوں نے مارشل لاء صرف دو تین مہینے جاری رکھا تھا۔

اب ذرا پاکستان کے مارشل لاء کا بھی تجزیہ کر لیا جائے پاکستان میں امن وامان تھا۔حکومتی ڈھانچہ' عدالتی نظام اور عوامی تنظیمیں سب اپنی اپنی جگہ پر قائم تھیں کہ اچانک مارشل لاء لگا دیا گیا اور اس غرض سے یہ تھی کہ چند مخصوص آدمیوں کی حکومت زبردستی ملک پر ٹھونس دی جائے۔لوگوں کو ان کے جمہوری حقوق سے محروم کر دیا جائے اور الیکشن کے آگے بند ڈال دیا جائے۔ یہ مارشل لاء قریباً چار سال جاری رہا۔البتہ نتیجے کے لحاظ سے دونوں مارشل لاء ایک ہی جیسی نوعیت کے تھے۔ انگریزوں کے مارشل لاء نے ہندوستانی عوام میں یہ احساس زندہ کر دیا کہ اس غیر ملکی

حکومت کے جوئے سے نجات حاصل کر لینا چاہیے۔ چنانچہ ملک میں آزادی کی تحریک دن بدن زیادہ ہونے لگیں اور انجام کار انگریز مجبور ہو گئے کہ دیش کو آزاد کر دیں اور یہاں سے نکل جائیں۔ پاکستان کے مارشل لاء نے بھی عوام الناس میں یہ احساس اور جذبہ مضبوط کر دیا ہے کہ پاکستان کی حکومت عوام کی نمائندہ حکومت نہیں ہے' بلکہ زور زبردستی ظلم اور جبر و استبداد کے ذریعے ان کی پیٹھ پر سوار ہو گئی ہے جس طرح انگریز اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے کہ زور' زیادتی اور ستم رانی سے اپنی حکومت کو قائم رکھ سکیں اسی طرح پاکستان کے حکمران طبقے کے لوگ بھی اپنے مقصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکیں گے اور ایک دن بھی ایسے ہی ختم ہو جائیں گے کہ جیسا کہ انگریز ختم ہو گئے۔

میں جب سے رہا ہو کر آ گیا تو میں نے لوگوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ دیکھا اور جہاں کہیں بھی ہم غم و خوشی کے موقع پر اکٹھے ہوتے وہاں لوگ ملک و ملت کی باتیں کرتے نظر آتے اب لوگوں کے دلوں میں وہ خوف بھی نہیں رہا تھا جیسا کہ پہلے رہا کرتا تھا۔ اس وقت خلافت کی تحریک بھی بڑے زور و شور سے شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستانی بھی ایک عجیب قوم ہیں۔ بیرونی ملکوں میں ان کی بڑی دلچسپی رہتی ہے۔ جتنی دلچسپی ہندوستان کے مسلمانوں نے اس تحریک میں لی تھی اگر اتنی دلچسپی انہوں نے اپنے ملک کی قومی تحریک میں لی ہوتی تو آج وہ دنیا کی قوموں کی صف میں اتنے دور افتادہ اور پسماندہ نہ ہوتے۔ لیکن پھر بھی اس تحریک نے انہیں بہت بڑا فائدہ پہنچایا تھا اور وہ یہ کہ ان کی تنظیم بن گئی۔ شہروں کی بات ہی کیا ہے دیہات

میں بھی خلافت کمیٹیاں بن گئیں۔ لیکن اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ یہ اس تنظیم کو قائم نہ رکھ سکے۔ وجہ یہ تھی کہ ابھی لوگوں میں اس تنظیم قائم رکھنے کی اہلیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اور جب تک یہ اہلیت پیدا نہیں ہوئی تھی تب تک کوئی قوم یا ملک کسی قسم کی تنظیم قائم نہیں کر سکتا۔ اہلیت پیدا کرنے کے لیے دو چیزوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے اول صحیح عقیدہ یا راستہ اور دوسرا اس راستے پر چلنے کے لیے صحیح لوگوں کا آگے آنا۔ جو اس راستے عقیدے یا مذہب کے علم بردار بن جائیں۔

دنیا میں بڑے بڑے پیغمبر آئے ہیں لیکن آپ دیکھ لیجیے کہ انہوں نے اپنی قوم میں ایسے نیک اور پاک بے غرض لوگ نہیں پیدا کیے جنہوں نے ان کے ساتھ خدا کے واسطے کمر کس لی ہو تو وہ پیغمبر بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مذہب بھی ایک تحریک ہی ہوتی ہے اگر اس تحریک میں بے لوث بے غرض اور پاک لوگ شریک ہوتے ہیں جنہوں نے خدا کے واسطے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کے لیے کمر کس لی ہوتی ہے تو وہ مذہب کامیاب ہوتا ہے۔ ایسے لوگ خلق خدا کو بھی فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور اپنے ملک و ملت کو بھی سرخرو و شاداب کر سکتے ہیں۔

میں جب قید سے باہر آیا تو ماں باپ نے میری منگنی کر رکھی تھی اور ان کی خواہش تھی کہ میری شادی ہو جائے۔ چنانچہ میں اور میرا ایک دوست محمد عباس خان سودا سلف لینے کے لیے پشاور روانہ ہو گئے جب ہم سرو ریاب پہنچے تو پل کے کنارے پولیس ہمارے لیے بیٹھی ہوئی تھی اس نے ہم دونوں کو پکڑ لیا اور ہمیں واپس چارسدہ کے تھانے میں لے آئے اس جگہ سے ہمارا چالان پھر پشاور کر دیا۔ پولیس افسروں

کے ہمراہ جب ہم پشاور پہنچے تو سیدھے سی۔آئی۔ڈی کے بڑے افسر مسٹر شارٹ کے بنگلے پر لے گئے ہمیں بنگلے کے باہر سڑک پر کھڑا کر دیا گیا اور ایک پولیس افسر اندر چلا گیا اس نے شارٹ کے پاس ہماری ڈیوٹی کر دی تا ہم سڑک پر کھڑے تھے دیگر پولیس افسر بھی ہمارے ساتھ کھڑے تھے شام کا وقت تھا اور دسمبر کا مہینہ خوب کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ہم ایسی سخت سردی میں باہر سڑک پر کھڑے ہوئے تھے اور فرنگی کے لیے کمرہ میں آگ جل رہی تھی اور وہ بڑے آرام سے آگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔اس میں اتنی انسانیت نہ تھی کہ ہماری تکلیف پر ذرا بھی احساس کرتا۔میرے ساتھی عباس خاں نے مجھ سے پوچھا ''ہماری یہ گرفتاری کس جرم میں ہوئی ہے؟ اور جب ہمیں پیش کیا جائے گا تو ہم کیا کہیں گے''؟

میں نے اسے کہا ''سچ سچ کہہ دینا خبردار جھوٹ مت بولنا''۔

رات کافی گزر چکی تھی یکا یک عباس کے نام پر آواز آئی۔اسے اندر لے جایا گیا اور پھر مجھے بھی شارٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا شارٹ طبیعت کے لحاظ سے بڑا سخت آدمی مانا جاتا تھا۔

اندر جا کر یہ معلوم ہوا کہ نوشہرہ میں بم پھینکا گیا ہے اور میں اور عباس خاں اسی سلسلے میں گرفتار کیے گئے ہیں شارٹ مجھ پر سوال کرتا تھا اور میں جواب دیتا تھا۔میں زور زور سے بولتا تھا اس سے شارٹ جھنجھلا کر مجھ سے بولا ''آہستہ بات کرو'' پھر جب میں نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا تو اس نے کہا ''زور سے بولو''۔

میں نے اسے کہا ''اگر میں زور سے بولتا ہوں تو تم کہتے ہو کہ آہستہ بولو۔اور اگر

آہستہ بولتا ہوں تو تم کہتے ہو کہ زور سے بولو۔ بہتر یہ ہو گا کہ پہلے تم مجھے باتیں کرنے کا ڈھنگ بتا دو‘‘

اس بات سے شارٹ آگ بگولہ ہو گیا لیکن مجھے اس نے کچھ نہ کہا البتہ اس نے پولیس کو آواز دی اور مجھے اس کے حوالے کر دیا۔ پولیس والے مجھے صدر تھانہ لے گیا اور حوالات میں بند کر دیا۔ اس رات کسی نے مجھے روٹی بھی نہ دی اور میں نے بھوکوں رات گزاری میری ساتھی عباس مجھ سے جدا کر دیا گیا تھا اور اسے کہیں کسی دوسرے تھانے کی حوالات میں بند کر دیا گیا تھا۔ ایک طرف سردی تھی دوسری طرف حوالات کا فرش سیمنٹ کا بنا تھا۔ حوالات کی کوٹھری کے دروازے ندارد تھے حوالات میں چند ایک گلے سڑے کمبل پڑے تھے جو بدبو دار اور جوؤں سے بھرے ہوئے تھے انہیں جب میں دیکھتا تھا تو مجھے کراہت ہوتی تھی لیکن دوسری طرف سردی نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا آخر میں مجبور ہو گیا اور وہی کمبل جسم پر اوڑھ لیے۔ جب صبح سویرے اٹھا تو میرے کپڑے جوؤں سے بھر چکے تھے۔ مگر قہر درویش بر جان درویش میں جوؤں کو پکڑتا اور باہر پھینک دیتا۔ ایک ہفتہ میں حوالات کی اس کوٹھری میں بند رہا اس کے بعد پھر مجھے اسی فرنگی شارٹ کے سامنے پیش کیا گیا جب میں انگریز کے سامنے لایا گیا تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔

میں نے اسے پوچھا آخر مجھے یہ تو بتایا جائے کہ مجھے کس بنا پر گرفتار کیا گیا تھا اور اب کس طرح مجھے رہا کیا جا رہا ہے؟‘‘

اس نے مجھے جواب دیا ’’میں تحقیقات کر رہا تھا‘‘۔

میں نے پھر استفسار کیا ''کیا یہ تحقیقات مجھے گرفتار کرنے سے پیشتر نہیں کی جا سکتی تھیں''۔

اس نے پھر جواب یہ دیا ''یہ میری مرضی پر منحصر ہے کہ پہلے میں تحقیق کروں بعد میں میں کسی آدمی کو گرفتار کروں یا پہلے کسی آدمی کو پکڑ لوں اور پھر تحقیقات کروں''۔

میں نے اسے کہا ''آخر میں انسان ہوں میری حیثیت کو دیکھو مجھے بلا وجہ اس قدر تکلیف کیوں دی گئی ہے میں کہیں بھاگتا تو نہیں تھا۔ تم نے تحقیق کی ہوتی اگر میں گناہ گار ثابت ہوتا تو پھر تم مجھے گرفتار کر لیتے''۔

اس نے چھوٹتے ہی مجھے روکھا سوکھا جواب دیا۔ ''تمہاری پوزیشن ہی کیا ہے؟''

میں نے اسے کہا ''بہت اچھا......''میں باہر نکل آیا اور اپنے گاؤں کو چلا گیا۔

☆☆☆

امان اللہ خان سے ملاقات

۱۹۲۰ء میں میری دوسری شادی ہوگئی۔ اسی سال دہلی خلافت کمیٹی آل انڈیا کانفرنس ہوئی میں بھی اس کانفرنس میں شامل ہوا۔ اس کانفرنس میں عزیز نامی ایک جوشیلا نوجوان تھا اس نے ہجرت کی تحریک پیش کی اور کہا کہ ہمیں اس ملک سے ہجرت کرنی چاہیے۔ یہ بات اس وقت تو ہمیں ایک کھیل نظر آتی تھی۔ لیکن کھیل سے یہ مذاق اور پھر مصیبت کی شکل اختیار کرگئی اس مصائب انگیز مذاق نے پٹھانوں کو سب سے زیادہ مالی اور جانی نقصان پہنچایا کانفرنس کے بعد پشاور میں ایک ہجرت کمیٹی بن گئی اور جو بھی اصحاب ہجرت کرکے افغانستان جاتے وہ اسی کمیٹی کے ذریعے جاتے تھے اور یہ ان کے لیے ہر قسم کی سہولت اور آرام کا انتظام کرتی تھی۔ شروع میں تو انگریزوں کی یہ کوشش تھی کہ لوگ ہجرت کر کے افغانستان نہ جائیں۔ لیکن جب حکومت نے یہ سمجھ لیا کہ لوگ باز نہیں آتے تو اس نے ایک بات پر زور دیا کہ بے شمار لوگ ہجرت کر کے چلے جائیں۔ کیونکہ ایک تو وہ افغانستان کے لیے مشکلات پیدا کردیں گے۔ دوسرے سرکار اس بہانے سے ہندوستان سے سیاسی کارکن بھی باہر نکال دے گی اور خود بے فکر ہو جائے گی اس طرح انگریزوں نے ہر طرف سے فائدہ اٹھایا۔

انگریزوں نے مہاجرین کے ساتھ ساتھ اپنے بہت سے تربیت یافتہ جاسوس بھی افغانستان بھیج دیے۔ ہمارے ملاؤں اور مذہبی رہنماؤں نے فتوے صادر کرنے

پر زور لگا رکھا تھا جو ہجرت نہیں کرے گا اس کا بیوی سے تعلق قطع ہو کر طلاق ہو جائے گی۔ کہتے ہیں کہ ہرنی ویسے ہی تیز گام تھی جب اسے گھنگھرو پہنا دیے گئے تو پھر کوئی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکا کہ کدھر چلی گئی۔

مردوں سے عورتیں زیادہ تیز ہو گئیں میں نے خود ہجرت کی اور سارا تماشہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا امان اللہ خان لوگوں کو زمینیں دیتا تھا۔ نوکری بھی دیتا تھا اور تجارت میں حصہ بھی دیتا تھا لیکن انگریزوں کی طرف سے مہاجرین میں بھیجے ہوئے جاسوس یہ پراپیگنڈہ کر رہے تھے کہ "بھائی ہم یہاں زمینیں لینے کو تو نہیں آئے نہ ہی نوکری یا تجارت کرنے کے لیے آئے ہیں ہم تو یہاں جہاد کرنے کے لیے آئے ہیں"۔

امان اللہ خان ان سے کہتا تھا "میں تو انگریز کے ساتھ لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا میں تمہیں یہاں ایک نو آبادی دے دوں گا تم لوگ پہلے اپنے اندر انگریزوں سے جنگ لڑنے کی طاقت تو پیدا کر لو مجھ سے بھی جس قدر ہو سکے گا میں بھی تمہاری امداد کروں گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ انگریز تو کالا سانپ ہے مجھے اطمینان سے نیند لینے نہیں دیتا۔ اس کی طرف سے مجھے ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ ابھی مجھے ڈس لے گا"۔

لیکن انگریز کے جاسوسوں نے مہاجرین کے درمیان ایسا کام شروع کر رکھا تھا کہ توبہ بھلی۔ کابل میں بھی ہجرت کا مخالف ایک ایسا ہی گروہ موجود تھا وہ بھی چھپ چھپ کر ہجرت کو ناکام بنانے کی کوشش کر رہے تھے اگرچہ امان اللہ خان نے ان

مہاجرین کو گرنے سے بچانے کی بہت زیادہ کوشش کی لیکن وہ لڑھک ہی گئے اور وہ ہجرت ناکام ہوگئی۔

جب میں کابل میں تھا تو ایک دن میں امان اللہ خان سے ملاقات کرنے کو چلا گیا میں نے ان سے ملاقات کی انہیں اور تو بہت سی زبانیں آتی تھیں لیکن پشتو نہیں جانتے تھے ملاقات کے بعد میں نے ان سے کہا۔

''میں اپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ اجازت دیں''۔

انہوں نے کہا ''ضرور کہو اجازت ہے''۔

میں نے ان سے کہا '' کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ کو اور زبانیں تو آتی ہیں لیکن پشتو جو آپ کی اور افغانستان کی قومی زبان ہے وہ آپ کو نہیں آتی''۔

انہوں نے یہ بات محسوس کی اور جلد ہی انہوں نے پشتو بھی سیکھ لی اس وقت نادر خان وزیر جنگ تھے اور سردار داؤد خان کے باپ سردار عبدالعزیز خان وزیر تعلیم تھے۔ان بھائیوں سے میرے اچھے تعلقات تھے سردار عبدالعزیز خان نے ایک دن مجھ سے کہا کہ میں حبیبیہ کالج دیکھنے جاؤں اور میں وہاں گیا کالج کے پرنسپل کی اجازت سے میں نے بعض جماعتوں کے لڑکوں سے سوالات پوچھے۔

''شما کیستی''؟ تم کون ہو؟

انہوں نے جواب دیا ''افغان ہستیم'' ہم افغان ہیں۔

میں نے پھر انہیں کہا ''ملک شما؟''

لڑکوں نے جواب دیا ''افغانستان''۔

''زبان شما؟''

''افغانی''

میں نے ان سے پھر پوچھا ''شما مے دانی؟'' تم وہ جانتے ہو

انہوں نے کہا ''نے'' اور وہ چپ ہو گئے آنکھیں نیچی کر لیں۔

میں نے انہیں کہا '' بگو آغا بگو'' کہو آقا کہو بھی

جواب ملا ''نمے دانم'' میں نہیں جانتا

اب میں نے انہیں کہا کہ ''خوب افغان ہستی افغانی نمے دانی'' تم افغان ہو کہ اپنی افغانی زبان ہی نہیں جانتے

محمود طرزی افغانستان کے وزیر خارجہ تھے وہ ایک نہایت قابل اور لائق انسان سمجھے جاتے تھے۔ ایک دن انہوں نے ایک بہت بڑی ضیافت کا اہتمام کیا اس میں میں بھی مدعو کیا گیا۔ وہاں ضیافت میں شریک ہوئے اصحاب میں زبان کے سوال پر بحث چھڑ گئی اس موقع پر محمود طرزی نے فرمایا ''ہمارے لوگ فارسی بھی بولتے ہیں اور پشتو بھی''۔

جواب میں میں نے ان سے کہا ''پشتو تو افغانستان کی قومی زبان ہے ہم تو فارسی بولنے سے کسی کو منع نہیں کرتے ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں نے اپنی زبان کیوں بھلا دی ہے؟ پھر یہ تو اکثریت کی زبان ہے۔ انگریز جب ہندوستان آئے تھے اس وقت ہندوستان کی ایک بھی زبان ان کی زبان نہیں تھی ارو نہ ہی ہندوستان میں کسی کو ان کی زبان آتی تھی۔ لیکن انہوں نے ہندوستان کی کسی بھی زبان کو حکومت کے

کاموں میں رائج نہیں کیا تھا اور اپنی زبان کو سرکاری زبان بنایا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہندستان میں کروڑوں لوگوں نے اسی زبان کو سیکھ لیا ہے اور آج ہندوستان کے بعض حصوں کے لوگ دوسرے حصے کے لوگوں کی زبان تو نہیں سمجھتے لیکن ہندوستان کا ایسا کوئی حصہ نہیں ہے جس انگریزی نہ آتی ہو۔اسی طرح سرکاری زبان بنایا ہوتا تو آج اس ملک میں ایک آدمی بھی ایسا نہ ہوتا جو پشتو نہ سمجھتا اور اس ملک اور قوم نے بڑی ترقی کی ہوتی کیونکہ قوم کی ترقی اس کی اپنی زبان سے ہوتی ہے‘‘۔

☆☆☆

انجمن اصلاح الافاغنہ کا قیام

ہمارے صوبے سے ہجر تکر کے جتنے بھی لوگ افغانستان گئے وہ سب واپس چلے آئے میرے بعض ساتھی تاشقند چلے گئے اور میں چند ساتھیوں کے ہمراہ باجوڑ چلا آیا یہاں ان آزاد قوموں کی بستیوں میں مدرسے قائم کیے جائیں دیر کے علاقے میں خالونام کے ایک گاؤں میں ہم نے ایک مدرسہ بھی کھول دیا اور اس میں مولسی فضل محمود صاحب مخفی کو اس کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس گاؤں کے لووں میں تعلیم کا بہت شوق ہے اور ان کے بچے بڑے ذہین ہیں لیکن تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کلب نامی ایک انگریز جو مالاکنڈ کا پولیٹکل ایجنٹ تھا اور ہمارے ہاں اسسٹنٹ کمشنر بھی رہ چکا تھا۔ وہ پٹھانوں کی اس تحریک کا بہت سخت مخالف اور دشمن تھا اس نے نواب دیر کو بلا بھیجا اور اسے متنبہ کیا ''دیکھو اس تعلیم نے ہمارے لیے کتنی مشکلات پیدا کی ہیں اب تم اپنے لیے مشکلات پیدا مت کرو۔ یہ مدرسہ جو تمہارے علاقے میں کھلا ہے اسے فوراً تباہ کر دو'' نواب نے مدرسہ مسمار کر دیا

اس قسم کے حالات تھے جن میں ہمیں کام کرنا پڑا اور آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں کتنی دشواریوں کا سامنا ہوتا تھا۔

میں نے حتی المقدور اس سمت میں کوششیں جاری رکھیں اور دیر اور باجوڑ دونوں ریاستوں کا دورہ کیا میرے جو ساتھی تھے وہ سب چلے گئے ان میں سے ایک بھی میرے ساتھ نہ رہا چونکہ اب میں یکسر اکیلا رہ گیا تھا۔ اسی لیے میں بھی واپس چلا آیا۔

اب میرے دل میں پھر وہی خیال موجزن ہوگیا کہ وہ مدرسے جو انگریزوں نے جنگ کے زمانے میں بند کردیے تھے انہیں پھر سے جاری کرنے کی کوشش کروں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت اور کانگریس ایک ہی اسٹیج پر جلسے کرتے تھے اور انہی دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کوئی تقریب تھی میرے اور میرے دوست قاضی عطاء اللہ کے نام دعوت نامے آئے ہم دونوں علی گڑھ چلے گئے پھر ہمارا یہ خیال تھا کہ ہم خلافت کے جسے میں بھی شرکت کریں گے۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں ہمارے صوبہ کے بہت سے طلبا تعلیم پا رہے تھے۔ہم نے ان سے تبادلہ خیالات کیا ان میں ایسے طلبا بھی تھے جنہوں نے ترک موالات کی وجہ سے کالج چھوڑ دیا تھا۔ یہ دسمبر ۱۹۲۰ء کے آخری دن تھے میں اور قاضی صاحب بوجہ مصروفیت خلافت کانفرنس کے جلسے میں شامل نہ ہو سکے اور واپس اپنے گاؤں چلے آئے۔انہی دنوں میرے بھائی ڈاکٹر خان صاحب تقریباً پندرہ سال کے بعد انگلینڈ سے واپس آ گئے تھ۔ جنگ کے زمانے میں جب انہوں ے ڈاکٹری پاس کر لی تھی اسی وقت وہاں فوج میں بھرتی ہو گئے تھے اب وہ کپتان تھے اور مردان کے گائیڈز میں تعینات تھے۔

فروغ تعلیم کے لیے ہماری کوششیں جاری تھیں۔۱۹۲۱ء میں ہم نے اتمان زئی میں دوستوں کی امداد سے ایک آزاد ہائی سکول کی بنیاد ڈالی اس سکول میں قاضی صاحب عطاء اللہ میاں احمد شاہ حاجی عبدالغفار خان خان محمد عباس خان عبدالاکبر خان تاج محمد خاں‘ عبداللہ شاہ اور خادم محمد اکبر میرے ساتھی تھے۔

میں نے ایک انجمن بنائی جس کا نام رکھا ''انجمن اصلاح الافاغنہ'' ہمارے سکول میں استادوں کی قلت تھی اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ تھوڑی تنخواہ پر اچھے استاد ملتے نہیں تھے اور ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ استادوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دے کر ان کی خدمات حاصل کر سکتے' اس لیے میں خود لڑکوں کو سبق پڑھایا کرتا تھا اور انہی دنوں لاہور میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی ہم بھی اس میں شریک ہوئے اس کانفرنس میں ضلع بنوں کے میراخیل' گاؤں کے امیر مختار خان سے میری ملاقات ہوئی وہ بھی اسی جلسے میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے دو صاحبزادے بھی تھے جن میں بڑے صاحب زادے کا نام امیر ممتاز خان اور چھوٹے کا نام مقصود جان تھا یہ دونوں بھائی پشاور اسلامیہ کالج میں بی اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان دونوں نے بھی تحریک ترک موالات کی وجہ سے کالج چھوڑ دیا تھا۔ یہ دونوں لڑکے ان کے باپ نے ہمارے سکول کے لیے دے دیے تھے مقصود جان ہمارے سکول میں سب سے پہلا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اور جب وہ دوبارہ اپنی تعلیم جاری کرنے کے لیے واپس پشاور چلا گیا تو اس کی جگہ اس کا بھائی امیر ممتاز خان ہمارے مدرسے کا ہیڈ ماسٹر ہو گیا۔

انگریزوں کو ہمارا یہ مدرسہ پسند نہیں تھا ہمارے مدرسے میں جو بھی معلم آتا ان کی طرف سے اسے ڈرایا دھمکایا جاتا تھا اور جب ڈرانا دھمکانا کارگر ثابت نہ ہوتا زیادہ تنخواہ دینے کا لالچ دے کر ہم سے اسے لے جاتے اسی طرح مقصود جان بے چارہ جب کبھی امتحان دینے آتا تھا تو پولیس اسے پریشان کرنے کے لیے کئی ہتھکنڈے

استعمال کرتی تھی ۔ یہاں تک کہ اسے سخت تکلیف پہنچانے میں دریغ نہ کرتی تھی ۔

تحریک خلافت کے سلسلے میں ہم سرگرم رہتے تھے ۔ لیکن دشواریاں اس راہ میں بھی کم نہ تھیں پشاور میں تحریک خلافت کے مسئلے پر ہمارے ساتھیوں میں نااتفاقی پیدا ہوگئی تھی اور ان کی دو پارٹیاں بن گئی تھیں ۔ ایک دن حاجی جان محمد صاحب اور ان کے ساتھیوں نے شاہی باغ میں ایک جلسہ عام منعقد کیا اور اس جلسے میں یہ تجویز کی کہ کیا آپ لوگوں کو حاجی جان محمد صاحب خلافت کمیٹی کے صدر منظور ہیں لوگوں نے اس تجویز کو زور شور سے تائید کی اور وہ صدر بن گئے ۔ دوسرے دن پشاور کے ایک سید صاحب اور ان کے ساتھی جمع ہو گئے انہوں نے بھی جلسہ بلا لیا اور لوگوں سے کہا کہ یہ سید صاحب آل رسول ہیں اور انہوں نے خدمات بھی کی ہیں ۔ اس لیے حاجی جان محمد صاحب سے ان کا حق زیادہ ہے مناسب یہ ہے کہ انہیں خلافت کمیٹی کا صدر بنا دیا جائے لوگوں نے چلانا شروع کیا کہ ''منظور ہے 'منظور ہے''۔

☆☆☆

جیل کے دن اور جیل کی راتیں

اس قسم کے حالات کے درمیان خلافت تحریک کا کام چل رہا تھا کارکنان کے درمیان دن بدن کشمکش بڑھ رہی تھی اور بیچ بیچ میں کچھ کام بھی نہیں ہوتا تھا کارکنوں کی طرف سے کسی ایک آدمی پر اتفاق نہیں کیا جاتا تھا پشاور کے لوگ اچھے کام کرنے والے تھے' لیکن اس بے اتفاقی نے ان کو بے کار بنا رکھا تھا۔ میں کبھی کبھار خلافت کے دفتر میں جایا کرتا تھا تو دونوں فریق مجھ سے یہی باتیں کرتے تھے دونوں پارٹیوں کے میرے ساتھ اچھے تعلقات اور بہت پیار و محبت تھی۔ مجھے دونوں کہا کرتے تھے دونوں پارٹیوں کے میرے اچھے تعلقات اور پیار و محبت تھی۔ مجھے دونوں کہا کرتے تھے کہ تمہارے اوپر اعتماد و اتفاق ہے' لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ آپ صدارت منظور کر لیں لیکن مجھے اس میں دلچسپی نہیں تھی کیونکہ میں صدارتوں اور عہدوں کا شوقین نہیں تھا اور میں ان چیزوں سے دور بھاگتا تھا۔ آخر مجھے انہوں نے مجبور کیا اور میں نے اس شرط پر ان کی صدارت منظور کی کہ صوبہ سرحد میں جس قدر چندہ جمع ہوگا' اسے اسی صوبہ میں تعلیم پر خرچ کیا جائے گا اور دوسری طرف کسی طرف بھی نہیں لگایا جائے گا میں خلافت کمیٹی کا صدر بن گیا اور عبدالقیوم خان سواتی سیکرٹری ہو گئے۔

میں سکول میں کام سے بے فکر ہو گیا اور میں نے میاں احمد شاہ کے علاقے میں دورے شروع کر دیے۔ ایک مقصد یہ تھا کہ لوگوں سے تبادلہ خیالات کے مواقع حاصل ہوں گے دوسرا یہ کہ وہ پرانے مدرسے پھر سے جاری کیے جا سکیں گے۔

ہمارے مدرسے کو جاری ہوئے ابھی چھ مہینے ہوئے تھے کہ ہمارے صوبہ کے چیف کمشنر نے میرے والد صاحب کو بلا کر ان سے کہا ''دیکھو سب لوگ آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں اور تمہارا یہ لڑکا گاؤں گاؤں میں پھر رہا ہے' دورے کر رہا ہے اور مدرسے کھول رہا ہے جب دوسرے لوگ نہیں کھولتے تو تم بھی مہربانی کرو۔ اپنے لڑکے سے یہ کہہ دو کہ یہ بھی اپنے گھر میں آرام سے بیٹھ جائے''۔

جب میرے والد گھر آئے تو مجھے خلوت میں لے جا کر کمشنر صاحب کی وہ سب باتیں کہہ دیں اور ساتھ ہی سمجھایا ''بچہ! آرام سے بیٹھو جب دوسرے لوگ نہیں کرتے تو تم بھی مت کرو''۔

میں ابا جان کی اس بات سے بڑا پریشان ہوا اور دل ہی دل میں کہنے لگا کہ دیکھو یہ انگریز لوگ اپنے مطلب کے لیے باپ بیٹا میں اختلافات پیدا کرتے ہیں۔ میرے والد صاحب ایک مذہبی خیال آدمی تھے میں نے ان سے عرض کیا ''اگر یہ تمام لوگ نماز ادا نہ کریں تو ابا جان! آپ مجھے یہ تو نہ کہیں گے کہ نماز ادا نہ کرو؟''

والد صاحب نے جواب دیا ''واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے نماز تو ایک فرض ہے''۔

میں نے انہیں کہا ''بس جس طرح نماز ایک ضروری فرض ہے اسی طرح علم اور قوم کی خدمت بھی فرض ہے''

اب ابا جان نے مجھے سنجیدگی سے کہا ''اچھا اگر یہ فرض ہے تو پھر کرتے رہو''

یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور انہوں نے لاٹ صاحب سے کہہ دیا ''صاحب بہادر! ہم تمہارے لیے اپنے مذہب نہیں چھوڑ سکتے''۔

تھوڑے دنوں کے بعد حکومت نے مجھے گرفتار کرلیا اور مجھ سے ضمانت طلب کی گئی میں نے انکار کیا تو ۱۹۲۱ء کو ایف سی آر دفعہ ۴۰ کے تحت مجھے تین سال کے لیے قید سخت کی سزا دی گئی ۔ اس وقت جیل خانے بھی عجیب قسم کے ہوتے تھے خوراک' خوراک کی طرح نہیں ہوتی تھی اور کپڑے کپڑے کی طرح نہیں ہوتے تھے۔ ہمارے گاؤں کا ایک باپ بیٹا دونوں بیک وقت قید ہوئے تھے جب ان کے اپنے کپڑے اتروا لیے گئے اور جیل خانے کے کپڑے انہیں پہنا دیے گئے تو وہ بیٹا بے چارہ ان کپڑوں میں اپنے باپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ چیخ کر کہنے لگا کہ ''اے بابا تم کدھر چلے گئے'' باپ نے ایس کہا ''بیٹا میں تو تمہارے پاس ہی کھڑا ہوں''۔

یہ حال تو ان باپ بیٹے کا تھا اس روشنی میں اندازہ کیجیے کہ مجھ جیسا آدمی جس کی قید بھی لمبی ہو اور بدن بھی تو انا ہو تو اس کا کیا حال ہوا ہوگا؟ میں نے جب جیل کے کپڑے پہن لیے تو میری شلوار پنڈلیوں سے اوپر تھی اور اس کا آسن تنگ ہونے کی وجہ سے پھٹ جاتا تھا اور قمیض میری کمر تک بھی نہیں پہنچتی تھی۔

اس زمانے میں جب کوئی آدمی قید ہو جاتا تھا تو پہلے پہل اسے قید تنہائی کی کوٹھری میں بند کرتے تھے اس کو بیس سیر اناج پیسنے کو دیا جاتا تھا اور اس کے پاؤں میں بیڑیاں پہنائی جاتی تھیں اور اس کے گلے میں لوہے کی گول کڑی ہنسلی ہوتی تھی جس میں ایک چھوٹی سی چوبی تختی لٹک رہی ہوتی تھی اس تختی پر قیدی کے جرم کی دفعہ اور قید کی معیاد لکھی رہتی تھی۔

اسی جیل کا داروغہ ایک ہندو تھا وہ ایک تو دیانت دار تھا اور دوسرے وہ قوم

پرستوں سے ہمدردی بھی کرتا تھا اس نے مجھے تنہائی والی کوٹھری میں بند تو کر دیا تھا۔ لیکن چکی پیسنے کو نہیں دی تھی اور نہ ہی اس نے میرے پاؤں میں بیڑی ڈالی تھی۔ جیل خانے کی روٹی تو دیتا تھا لیکن وہ قدرے اچھی ہوتی تھی اور دال و ساگ بھی کھانے کے قابل تھا ہماری چکی قید تنہائی والی کوٹھری کا رخ شمال کی طرف تھا اور اس میں دھوپ بالکل نہیں لگتی تھی اور اس میں بڑی سخت سردی تھی۔

مجھے تین کمبل اور ایک بوری قسم کا ٹاٹ دیے گئے تھے لیکن اس میں گزارہ کرنا بڑا محال تھا۔ اس کے علاوہ ہم دن رات کوٹھڑی میں بند رہتے تھے۔ جب کبھی کسی اچھے جمعدار کی ڈیوٹی لگ جاتی تو ہمیں ایک آدھ گھنٹے کے لیے کوٹھڑی سے باہر نکال لیتا اور ہم لوگ دھوپ میں بیٹھ جاتے۔ ایک تکلیف یہ تھی کہ رات کو بھی آرام سے نیند نہیں لے سکتے تھے کیونکہ تین تین گھنٹے کے بعد ہمارے پہرے داروں میں تبدیلی ہوا کرتی تھی لہذا ایک کے بعد جب دوسرا پہرہ دار آتا تو وہ قفل کو کھٹکھٹا کر پھر آواز دیتا کہ "بول بھئی" جب تک اسے جواباً آواز نہیں دی جاتی وہ وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتا تھا اگر قیدی کی طرف سے آواز دینے میں تھوڑی سی سستی ہو جاتی تو دوسرے دن اس کو سزا ملا کرتی۔

مجھے جس وقت گرفتار کر کے پشاور جیل میں پہنچایا گیا تھا تو مجھے حوالات میں بند کر کے جیل خانے کی "قصوری چکی" کے اندر بند کر دیا گیا تھا۔ جب میں چکی کے اندر داخل ہو رہا تھا (یہاں چکی سے مراد وہ کوٹھری ہے جس میں قیدی کی مشقت کے لیے چکی رکھی رہتی تھی) تو چکی میں بڑی بدبو تھی کیونکہ اس میں پاخانے سے بھرا ہوا مٹی کا برتن پڑا ہوا تھا۔ میں نے جیل خانے کے افسر سے کہا کہ یہ چکی بہت گندی ہے

تو اس نے مجھے جواب دیا ''یہ جیل خانہ ہے'' اور مجھے چکی کے اندر دھکیل دیا گیا اور دروازہ بند کر دیا گیا۔

مجھے گرفتار کیے جانے کے بعد خلافت تحریک کے اور ساتھی بھی گرفتار کر لیے گئے تھے اور ایسی ہی چکیوں میں انہیں بند کیا گیا تھا۔ ہم چوبیس گھنٹے ان چکیوں میں بند رہتے تھے روٹی بھی ہمیں چکیوں کے جنگلے کی سلاخوں سے دی جاتی تھی صرف اس وقت ہماری چکیوں کے دروازے کھولے جاتے تھے جب جیل خانے کا بھنگی صفائی کے لیے آتا تھا۔ چکیوں کے باہر ہم پر ہر وقت ڈبل پہرہ لگا رہتا تھا۔ تاکہ کوئی شخص ہمارے نزدیک نہ پھٹک سکے نہ ہمارے ساتھ باتیں کر سکے اس ظالمانہ سلوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے اور ساتھیوں نے ضمانتیں داخل کر دیں اور صرف میں نے اور عبدالقیوم خان سواتی نے ضمانت دینے سے انکار کیا اور ہم دونوں کو تین تین سال قید سخت کی سزا دے دی گئی مجھے تین سال قید کا یہ حکم کیسے سنایا گیا یہ قصہ بھی سننے کے قابل ہے جب جیل خانے میں آئے ہوئے مجھے دس دن ہو گئے تھے تو مجھے چکی سے نکالا گیا تھا اور ڈپٹی کمشنر کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

ڈپٹی کمشنر ایک عجیب قسم کا انگریز تھا۔ اور میرا مقدمہ بھی عجیب ہی تھا جب مجھے پولیس نے اس کے سامنے پیش کیا تو اس نے میرے جرم کی بابت پوچھا پولیس نے اسے بتایا کہ ایک تو اس نے ہجرت کی ہے اور دوسرے اس نے آزاد سکول قائم کیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے انہیں کہا ''جب اس نے اس ملک میں ایک دفعہ ہجرت کی تھی تو پھر اسے کیوں واپس اس ملک میں آنے دیا گیا اور اسے ادھر داخل ہونے کی

اجازت کیوں دی گئی؟''

میں نے کہا ''افسوس تو اس بات کا ہے کہ ایک تو تم لوگوں نے ہم سے ملک لے لیا ہے اور اب اس میں ہمیں رہنے بھی نہیں دیتے ہو''۔

میرا یہ کہنا تھا کہ صاحب بہادر اور بھی جل بھن گیا اور پولیس کو حکم دیا کہ ''جاؤ اسے یہاں سے دور کرو، میں نے اسے تین ال قید کی سزا دے دی ہے''۔

پولیس مجھے لے آئی اور جیل والوں کے حوالے کر دیا۔

اس وقت جیل خانے میں قیدیوں کے لیے اپنے پاس کھانے کی چیز رکھنا بھی جرم تھا میں اپنی چکی (تنہائی کوٹھری) میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس دوران میں ہمارے گاؤں کا ایک قیدی نمبر دار آیا اس نے میری چکی پر دو ٹکڑے گڑ کے رکھ دیے اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس پہرے دار نے جس کا ہم پر پہرہ تھا مجھے کہا کہ جیلر صاحب آ رہے ہیں یہ سن کر مجھے اس گڑ کی فکر ہو گئی کہ اب اس کا کیا کروں گا کبھی سوچتا کہ کمبل کے نیچے چھپا لوں۔ کبھی خیال آتا کہ ٹاٹ کے نیچے دبا دوں پھر خیال آیا کہ اگر یہ کمبل جیلر نے اوپر اٹھا لیا تو میں کیا جواب دوں گا بہر حال وہ گڑ میں نے چھپا لیا۔

داروغہ صاحب آئے تلاشی نہیں لی اور واپس چلے گئے۔ اس وقت قیدیوں کی روزانہ تلاشیاں ہوا کرتی تھیں۔ جب داروغہ صاحب چلے گئے تو میں نے وہ گڑ اٹھایا اور باہر پھینک دیا پھر میں نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ جیل خانے میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جو جیل خانے میں ممنوع اور جیل کے قانون کے خلاف ہو گا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے انسان کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے میں نے اپنے بہت

سے ایسے بھائیوں کو دیکھا تھا جو اس قسم کے کام کرتے تھے تو وہ جیل والوں کی بڑی خوشامدیں کرنے کے علاوہ انہیں سلام بھی کیا کرتے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد مجھے ملنے کے لیے ڈاکٹر خان صاحب! اور کچھ لوگ آئے تھے وہ میرے لیے حکومت کا پیغام بھی لائے تھے حکومت کے پیغام میں یہ پیش کش کی گئی تھی کہ میں مدرسے بے شک کھول لوں مگر یہ دورے بند کردوں اور اگر دورے کرنے بند کردوں گا تو سرکار مجھے جیل سے رہا کردے گی۔ لیکن میں نے حکومت کی یہ پیش کش ٹھکرادی۔ ان چکیوں میں میرے ساتھ اور بھی بہت قیدی بند تھے ان میں چمرکند کے مجاہدین بھی شامل تھے میں جب کابل سے باجوڑ آیا تھا تو چمرکند مین ان مجاہدین سے ملنے گیا تھا اور انہیں میں نے بہت کچھ سمجھایا تھا کہ خیال رکھنا سرحد اور پنجاب کی طرف مت آنا کیونکہ ان کے کچھ آدمی گرفتار ہو چکے تھے۔ دوسری نصیحت میں نے انہیں یہ کی تھی کہ چندوں کے پیچھے تم لوگ کتنے دنوں تک پھرتے رہو گے کیوں نہ تم اپنے یہاں کھڈیوں کا کوئی کام دھندا شروع کردو۔ اس کے علاوہ تمہارے پاس خچریں بھی موجود ہیں اور تمہارے قریب کنڑ افغان کا علاقہ ہے وہاں قسم قسم کے میوے ہوتے ہیں اگر تم لوگ وہی میوے خریدو اور انہیں مہمندوں کے علاقے میں بیچو تو اس سے تمہارا گزرا اچھا ہوتا رہے گا اور دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنے سے تمہیں نجات مل جائے گی۔

یہ نصیحت میں نے انہیں اس لیے کی تھی کہ ان کے علاقے میں ایک دو دن رہ کر ان کے حالات و عادات کا مطالعہ کیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ لوگ بیکار پڑے

رہتے تھے۔

یہ مجاہدین بونیر لیس یہاں آئے تھے وہاں ان کی آپس میں لڑائی ہوگئی تھی۔اور انہوں نے اپنے امیر کوقتل کر دیا تھا یہ پنجابی تھے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ان پنجابی بھائیوں کی فطرت میں پارٹی بازی اور جھگڑے فسادات بھرے ہوئے ہیں اور بونیر میں جومجاہدین ہیں ان میں اکثریت بنگالیوں کی تھی اور وہ آپس میں پیار محبت سے رہے تھے لیکن ان میں جونہی یہ پنجابی شریک ہو گئےتو انہوں نے گروہ بندیاں اور جھگڑے فساد شروع کر دیے۔اور انجام کار انہوں نے امیر کوموت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔چنانچہ انہیں بونیر سے نکال دیا گیا تھا تب یہ لوگ چمرکند آ گئے تھے یہاں بھی ان میں پارٹی باقی جاری تھی اور ان کا لیڈر مولوی فضل الٰہی ایک بہت بڑا پارٹی باز اور خطرناک آدمی تھا کابل سے واپس ہوتے ہوئے میں نے اسے کابل میں دیکھا تھا اور میں نے اسے بڑی نصیحت کی تھی۔اسی فضل الٰہی نے ایک نہایت اچھے کارکن مولوی بشیر کو اسی ساز باز اور پارٹی بازی کی وجہ سے قتل کر دیا تھا مولوی بشیر ایک نہایت نیک اور مخلص کارکن تھے۔

جیل خانے میں ان مجاہدین کا بہت برا حال تھا یہ آپس میں ایک دوسرے کو بڑی سختی سے زدوکوب کیا کرتے تھے لیکن میرے آتے ہی ان کی حالت بہتر ہوگئی ان کا ایک آدمی جوقرآن شریف کا حافظ بھی تھا اسے پولیس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا ان میں جوبھی آدمی کام کا ہوتا تھا اسے وہ حافظ قرآن پولیس کو دکھلایا کرتا تھا اور خود کھسک جاتا تھا اور چمرکند سے اسی بہانہ سے اس آدمی کو روزانہ کر دیتا تھا کہ چلو فلاں

جگہ چلیں چندہ خوب ملے گا۔اسی طرح جب اسے اپنے ساتھ لے کر مقررہ جگہ پر پہنچ جاتا تھا تو اس بے چارے کو پولیس کی تحویل میں دے دیا جاتا تھا۔یہ قصہ ان مجاہدین نے مجھے سنایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ حافظ قرآن پھر نئے شکار کو پھانسنے کے لیے گیا ہوا ہے اب اس کی نظر ہمارے بہت اچھے اور ممتاز کارکن پر ہے اسے پولیس کا یہ جاسوس حافظ قرآن اپنے جال میں پھنسا کر یہاں لے آئے گا اس لیے کوئی ایسا انتظام ہو جائے کہ جس سے چمرکند میں اطلاع پہنچ جائے کہ اس حافظ قرآن کے ساتھ کوئی بھی شخص آنے کا نام نہ لے۔

ان مجاہدوں نے مجھ سےیہ بھی کہا کہ ''یہاں ایک مہمند بھی ہے وہ کچھ ہی دنوں کے بعد رہا ہونے والا ہے اس کا گھر چمرکند کے نزدیک ہے اور اگر میں ایک چھوٹا سا رقعہ لکھ دوں تو یہ رقعہ اس مہمند کے ہاتھ چمرکند پہنچوا دیں گے اس طرح ان کے وہاں کے مجاہدین کو اطلاع مل جائے گی اور وہ اس حافظ قرآن کے دام میں نہیں آئیں گے ۔پہلے میرا ارادہ اس قسم کا رقعہ لکھ کر دینے کا نہیں تھا لیکن جب میں نے سوچا کہ یہ تو ان لوگوں کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت اور عظیم نقصان ہے تو پھر میں نے ایک مختصر خط لکھا اور جس دن وہ مہمند رہا ہونے والا تھا اس سے ایک دن پہلے ہم نے اسے وہ خط دے دیا۔

اس جیل میں عام قیدی تو ان چکیوں میں ایک ہفتے تک بند کیے جاتے تھے لیکن مجھے بند ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے دو ماہ کے بعد مجھے اس جیل خانے سے ڈیرہ اسماعیل خاں کے اخلاقی مجرموں کے لیے مخصوص جیل میں منتقل کرنے کے لیے روانہ کر دیا گیا۔

ڈیرہ غازی خاں جیل منتقلی

مجھے ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچا دیا گیا لیکن پشاور سے لے جاتے وقت پھر جو دوسرے دن بیڑیاں پہنائی گئی تھیں وہ میرے پاؤں سے نہ نکالی گئیں اور مجھے چکی پیسنے میں بند کر دیا گیا۔ پھر دوسرے دن مجھے بیس سیر گندم پیسنے کے لیے دے دی گئی۔ لیکن یہ اچھا ہوا کہ اس گیہوں میں ایک دانہ بھی ثابت نہیں تھا۔ سب کیڑوں نے کھا رکھے تھے لہذا گندم پیسنے میں مجھے چنداں تکلیف نہ ہوئی اس جگہ کا داروغہ ایک بوڑھا مسلمان تھا وہ سپاہی کے عہدے سے داروغہ بنا تھا

وہ انگریزی نہیں جانتا تھا پنشن پر ریٹائر ہونے والا تھا جیل خانے کا سپرنٹنڈنٹ ایک انگریز تھا جو انگریزی کے علاوہ دوسری کوئی زبان نہیں جانتا تھا۔ اس وجہ سے جیل خانے کا سارا کام گنگا رام ہی کیا کرتا تھا وہ ڈپٹی جیلر تھا۔ داروغہ بہت نیک انسان تھا مگر گنگا رام سخت رشوت خور اور غلیظ آدمی تھا وہ رشوت حاصل کرنے کے لیے قیدیوں کو آپس میں لڑاتا بھڑاتا تھا ایک دن میں چکی پیس رہا تھا تو اس اثناء میں داروغہ صاحب آ گئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''یہ چکی تم مت پیسو''۔

میں نے پوچھا ''کیوں؟''

انہوں نے جواب دیا ''میں خدا کو کیا جواب دوں گا جب وہ مجھے کہے گا کہ اس جیل خانے میں چودہ سو قیدی موجود تھے ان میں سے ایک خدا کے واسطے آیا تھا تم نے اس سے بھی چکی پسوائی تھی؟''

میں نے ان کی دل جوئی کے لیے چکی پیسنا بند کر دیا اور جب وہ باہر چلے گئے تو میں نے پھر چکی پیسنا شروع کر دیا وہ باہر کھڑے ہو کر دروازے کے ایک چھوٹے سے سوراخ کے ذریعے مجھے دیکھ رہے تھے وہ پھر میری اسی کوٹھڑی کے اندر آ گئے اور بولے ''تم یہ چکی کیوں پیستے ہو؟''

میرے عین سامنے چکیوں کی دوسری قطار میں ایک آدمی چکی پیس رہا تھا میں نے داروغہ صاحب سے کہا '' آپ اس آدمی کو دیکھیں یہ ایک قتل اور رہزنی کا مجرم ہے اور اسی گندے مقصد کی بدولت یہ چکی پیس رہا ہے مگر میرا مقصد تو بڑا نیک و پاک ہے تو میں اپنے اس نیک و پاک مقصد کی بدولت چکی کیوں نہ پیسوں؟''

دوسرے دن داروغہ صاحب نے چکیوں کے جمعدار کو میرے متعلق یہ حکم دیا کہ مجھے آئندہ گیہوں کی بجائے آٹا دیا جائے۔ دوسرے دن جمعدار میرے پاس آٹا لے کر آئے تو اس کے ساتھ تھوڑے سے دانے بھی تھے یہ دونوں چیزیں میرے حوالے کرتے ہوئے جمعدار نے مجھ سے کہا ''جب صاحب آئے تو یہ گیہوں پیسنا''۔

میں نے ان سے کہا ''اگر صاحب نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تمہیں آٹا دیا جاتا ہے یا گیہوں؟ تو میں جھوٹ نہیں بولوں گا اور ان سے کہہ دوں گا کہ مجھے آٹا دیا جاتا ہے''۔

جمعدار بولے ''پھر تو میں نوکری سے بھی جاؤں گا''۔

میں نے ان سے کہا ''لیکن میں تو آپ کو موقوف نہیں کرانا چاہتا ہوں میں تو آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے دانے گیہوں دیا کیجیے۔''

اس جیل خانے کی خوراک بہت خراب تھی۔ روٹی میں اتنی مٹی ہوتی تھی کہ انسان

اسے چبا نہیں سکتا تھا اور جو ساگ ہمیں دیا جاتا تھا اسے تو میں بلی کے آگے رکھ دیتا تھا لیکن اس نے نیں کھایا۔ داروغہ صاحب نے مجھے بہتیرا کہا کہ وہ مجھے کھانا اپنے گھر سے بھجوا دیا کریں گے لیکن میں نے یہ منظور نہ کیا کہ جو آدمی دودھ بانٹا کرتا تھا وہ مجھے دودھ دینا چاہتا تھا لیکن میں نہیں لیا کرتا تھا کیونکہ دودھ میرے ٹکٹ پر نہیں لکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس آدمی کو کہا کرتے تھے کہ وہ مجھ دودھ دیا کرے لیکن میں دوسرے کا حصہ نہیں لیتا تھا ادھر گنگا رام تھا کہ اس نے میرے پاس ایجنٹ بھیجنے شروع کر دیے وہ مجھے کہا کرتے تھے "دیکھو گنگا رام کو کچھ دے دو ایسا کرنے سے تمہیں چکی قید تنہائی کوٹھری سے نکال دے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم پشاوریوں کے لیے یہ شرم کی بات ہے کہ تم چکی میں بند رہو اور گیہوں پیستے رہو اور اگر تم کچھ بھی نہیں دینا چاہتے تو ہم اپنی جیب سے دے دیں گے"۔

میں ان کی باتیں سن کر حیران ہوتا تھا اور کہتا "بھئی رشوت دینا اچھا کام نہیں ہوتا اس لیے نہ رشوت آپ دیں اور میں تو خیر کبھی دینے کا نہیں ہوں آپ نہیں جانتے کہ میں محض اس لیے سزا بھگت رہا ہوں ک میں ضمانت دینے سے انکاری ہوں اگر مجھے رشوت ہی دینی ہوتی تو میں ضمانت کیوں نہ دے دیتا تاکہ قید کی اذیت نہ اٹھانی پڑتی"۔

اس جیل خانے میں لڑکے قیدیوں کا بہت برا حال تھا جس کسی نے بھی گنگا رام کو پانچ روپے دے دیے وہ اپنی پسند کے لڑکے کو یا تو اپنے ساتھ چکی والی کوٹھری میں بند کر لیتا تھا یا اسے اپنے ساتھ بارک میں لے جاتا تھا ایک دن میں نے داروغہ

صاحب سے کہا ''آپ ایک اچھے نماز گار آدمی ہیں لیکن خدا کو اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ آپ کے جیل خانے میں مسلمان بچوں کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ پشاور جیل خانے میں جو ہندو داروغہ ہے وہاں مسلمان بچوں کی عزت پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا''۔

خیر بات تو جیل کی خوراک کی چل رہی تھی ایک دن میں چکی پیس رہا تھا اور باٹی میں وہ ساگ پڑا ہوا تھا کہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب آ گئے۔ میں نے وہ ساگ دکھلا کر ان سے کہا ''دیکھیے یہاں بلی آئی تھی میں نے اس کے آگے یہ ساگ رکھا تھا اور اس نے نہیں کھایا۔ یہ ساگ حیوان بھی نہیں کھاتے اسے آپ انسان کو دیتے ہیں''۔ یہ سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر بھی تھے انہوں نے مجھے کہا ''یہ ساگ تو بہت اچھا ہے''۔

اب میں اس بارے میں ان سے کیا کہتا۔ میں نے اسی طرح کوئی دوسری بات چھیڑ دی۔ میں نے کہا ''اچھا وہ سامنے کی چکی والا جو آدمی ہے ذرا اس کی بیڑیوں کو دیکھیے اور میری بیڑیاں دیکھیے وہ بھی بیس سیر گیہوں پیستا ہے اور میں بھی بیس سیر گیہوں پیستا ہوں۔ وہ بھی چکی میں بند ہے اور میں بھی چکی میں بند ہوں اس کا کیا جرم ہے اور میرا کیا جرم ہے؟ اور آپ کے دیس میں جو میری طرح کا قیدی ہوتا ہے اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک ہوتا ہے؟''

سپرنٹنڈنٹ نے مجھے کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔ دوسرے دن میری مشقت بدل دی مجھے کارخانے بھیج دیا تاکہ لفافے بناؤں ایک دن وہ سپرنٹنڈنٹ پھر ادھر آئے اور مجھ سے بولے' وہ کچھ دن کے بعد مجھے اس چکی (کوٹھری) سے نکال دیں

گے اس کارخانے میں صوبہ سرحد کے تمام ضلعوں کے قیدی تھے اکثر وہ آپس میں دست وگریباں ہوتے تھے اوران کے تمام جھگڑے لڑکوں کے سلسلے میں ہوتے تھے وہ سب میرے پاس آیا کرتے تھے اور میں انہیں آپس میں لڑنے جھگڑنے اور برے کاموں سے منع کیا کرتا تھا ان کے درمیان مفاہمت اور صلح صفائی کرا دیتا تھا۔

بعض ایسے قیدی بھی تھے جو مشقت سے ڈرتے تھے اور مشقت انہیں ایک بہت بڑی مصیبت نظر آتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ گنگارام کو رشوت دیتے تھے میں نے انہیں اس کام سے منع کر دیا اس سے گنگارام کی دکان جب ٹھنڈی پڑ گئی تو وہ اس فکر میں مبتلا ہو گیا کہ مجھے کسی طرح اس جیل خانے سے منتقل کر دے۔ میرے خلاف اس نے سپرنٹنڈنٹ سے رپورٹ کر دی کہ میں جیل خانے میں اپنا پروپیگنڈہ کرتا ہوں اور ان کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہوں اور اگر مجھے جیل میں رکھا جائے تو وہ جیل خانے کا ڈسپلن قائم رکھنے سے معذور ہو جائے گا۔ اس طرح میرے خلاف ایک مقدمہ سا بنالیا۔

گنگارام کی رپورٹ کے سلسلے میں سپرنٹنڈنٹ صاحب ادھر آئے انہوں نے مجھ سے چند استفسار کیے اور انہیں معلوم ہو گیا کہ گنگارام جھوٹ بولتا ہے' لیکن بیچ میں ڈسپلن کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ انگریز کے آگے ڈسپلن کا نام لے لو تو پھر اس سے جو بھی کرانا چاہو' کر سکتے ہو لہٰذا اسی ڈسپلن کی آڑ لے کر مجھے ڈیرہ غازی خان کے جیل خانے میں منتقل کر دینے کے احکام جاری ہو گئے میں نے دو مہینے پشاور کے جیل خانے میں گزارے تھے اور تقریباً دو ماہ ہی مجے یہاں آئے ہوئے گزرے تھے اس

عرصے میں میرا وزن پینتالیس پونڈ کم ہو گیا تھا اور خراب خوراک کی وجہ سے میرے دانتوں کے مسوڑھے خراب ہو گئے اور ان میں پائیوریا کا عارضہ لاحق ہو گیا۔

ایک دن جیل خانے میں پولیس کی موٹر آئی جس کے اردگرد چاروں طرف پردے لگے ہوئے تھے میرے ہاتھوں میں بیڑیاں‘ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور گلے میں طوق پڑا تھا جیل کے تنگ اور چھوٹے لباس میں مجھے خود اپنی شکل عجیب نظر آتی تھی خدا جانے لوگوں کو میں کیسا نظر آتا ہوں گا خیر ایک پردہ نشین خاتون کی مانند مجھے موٹر میں بٹھا دیا گیا اور دریا خان پہنچا دیا گیا۔ ریل گاڑی ہمارے پہنچنے سے پہلے نکل گئی تھی ہمیں رات اسٹیشن پر ہو گئی وہاں مجھے کسی کے نزدیک تک نہیں جانے دیا جاتا تھا اور نہ ہی کسی کو میرے پاس پھٹکنے دیا جاتا تھا اور تو اور کیا میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تک نہ کھولی گئیں میرے ساتھ پولیس والے سب پختون تھے اس پر طرفہ یہ تھا کہ تھانیدار انچارج تو ہمارے علاقے کا آدمی تھا جس کا نام نادر خان تھا اور وہ ڈیکائٹ کے نام سے مشہور تھا۔

دوسرے دن جب گاڑی آئی تو مجھے نوکروں کے ڈبے میں بٹھا دیا گیا راستے میں گاڑی جس اسٹیشن پر بھی پہنچتی مجھ پر اس قدر سخت پہرہ ہوتا کہ مجھے دیکھنے کے لیے کسی کو میرے قریب نہیں آنے دیا جاتا۔ ہم غازی گھاٹ پہنچ گئے وہاں مجھے لینے جو پولیس آئی ہوئی تھی اس کا افسر ہندو تھا وہ میرے پاس آیا اور پٹھان گارڈ سے میرا چارج لے لیا۔ اس نے میری ہتھکڑیاں کھول دیں اور مجھے کہا کہ آیئے تھوڑا اسٹیشن پر گھوم پھر لیجیے جب میں اس کے ساتھ ٹہل رہا تھا تو اس اثناء میں ہمارا وہ انچارج

پختون پر لیس افسر آیا اور اس نے ہندو پولیس افسر سے کہا ''ہائے ہائے یہ تم نے کیا کر دیا ہے مجھے تو تم نے غرق کر کے رکھ دیا ہے''۔

ہندو پولیس افسر نے جواب دیا ''اب یہ میرے چارج میں ہیں اور ان کی ساری ذمہ داری میرے سر پر ہے جاؤ تم فکر کس لیے کرتے ہو''۔

تھوڑی دیر بعد پولیس مجھے لے کر ڈیرہ غازی خان کے لیے روانہ ہوئی۔ دریا کے کنارے پہنچ کر کشتی کے ذریعے جب ہم نے دریائے سندھ کو پار کر لیا تو یہاں تانگہ موجود تھا اس میں ہم بیٹھ گئے اور ڈیرہ غازی خاں کے جیل خانے پہنچ گئے۔ میں جس وقت جیل خانے کے دروازے پر پہنچا اس وقت وہاں عبدالرشید خان' جو کرنل عبدالمجید خان کا لڑکا تھا' لالہ دنی چند انبالوی سے ملاقات کر رہا تھا اور ان کے ساتھ ان کے عزیز و اقارب آئے ہوئے تھے پھر جیل خانے کے اندر چلا گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا ''ہم نے جب تمہیں پہلے پہل دیکھا تو ہمارا خیال تھا کہ یہ کوئی بہت بڑا راہزن' ڈاکو اور قاتل ہو گا جسے یہاں لے آئے ہیں'' خیر جیل خانے کے اندر پہنچتے ہی میری بیڑیاں کاٹ دی گئیں یہ ایک چھوٹا سا جیل خانہ تھا اس میں پنجاب کے سیاسی قیدی تھے ایک بارک میں سی کلاس کے قیدی تھے اور دوسری میں سپیشل کلاس کے۔ ہمارے صوبہ میں کوئی کلاس نہیں تھی اس لیے مجھے سی کلاس کے قیدیوں میں رکھا گیا تھا۔

لیکن اس سی کلاس کی روٹی بہت اچھی تھی جیل خانے کا سپرنٹنڈنٹ بہت اچھا آدمی تھا وہ سیاسی قیدیوں کو گیہوں دیا کرتا تھا اور وہ اسے خود صاف کیا کرتے تھے اور

خود ہی اس کا آٹا پیتے تھے پھر اپنے ہی ہاتھوں سے روٹی پکایا کرتے تھے اور ہانڈی سالن بھی خود اپنے ہی لاتھوں پکایا کرتے تھے۔

میرے لیے سب سے بڑی مصیبت وہ بیڑیاں تھیں جن سے مجھے نجات مل گئی تھی۔ پھر سی کلاس کے سب قیدی سکھ اور ہندو تھے یہ بہت پیارے اور خوش خلق لوگ تھے میری تو بڑی آؤ بھگت کرتے تھے ان کی مشقت بان سازی تھی۔ اور میں یہ کام نہیں کر سکتا تھا میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہہ دیا کہ مجھے اس کی بجائے وئی اور کام دے دیا جائے۔ اسپیشل کلاس کے قیدیوں کو میرے بارے میں پتہ لگا تو انہوں نے بھی سپرنٹنڈنٹ کو میرے زور دیا کہ مجھے ان کی بارک میں منتقل کر دیا جائے۔ سپرنٹنڈنٹ ایک بہت اچھا مسلمان تھا اس نے انہی کی بارک میں بدل دیا اورم جھے چرخے کی مشقت لکھ دی یہ مجھ پر خدا کا بے حد فضل تھا کہ مجھے ڈیرہ اسماعیل خان سے ڈیرہ غازی خان کے جیل خانے میں منتقل کر دیا گیا اور اگر مجھے وہیں رکھا جاتا تو مجھے یقین نہیں ہے کہ میں صحیح سلامت رہ جاتا وہاں مجھے ایسے شستہ و شائستہ عالموں کی سوسائٹی کہاں ملنی تھی جس سے میں نے ایک بہت بڑا بھاری فائدہ اٹھایا اور سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ پنجاب کے لوگوں سے میری جان پہچان ہو گئی اور اچھے تعلقات پیدا ہو گئے اور اس کے علاوہ ہم ایک دوسرے کے خیالات اور عقائد سے بھی واقف ہو گئے۔ اور جب یہ لوگ حالات سمجھ گئے تو انہوں نے اخبارات کے ذریعے میرے حق میں سرکار کے خلاف اس قدر زوردار احتجاج کیا کہ حکومت کچھ عرصے ہی کے بعد مجھے بھی اسپیشل کلاس میں رکھنے پر مجبور ہو گئی۔

ڈیرہ اسماعیل خان میں خراب خوراک کی وجہ سے میرے دانت خراب ہو گئے تھے جب میں یہاں آ گیا تو سپرنٹنڈنٹ نے مجھے علاج کے واسطے لاہور سنٹرل جیل میں بھیج دیا۔ اس جیل کا داروغہ خیر الدین خان تھا' جس کی قوم پرستوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ وہ انگریزوں کو خوش کرنے کی خاطر بڑی سختی سے کام لیتا تھا اس کے بدلے میں انگریز نے اسے چھٹی دے رکھی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ جس طرح کا اس کا دل چاہے ویسا سلوک کرے اور اس کا سلوک سیاسی قیدیوں سے بہت خراب تھا۔ جیل خانے میں خلافت اور کانگریس دونوں کے قیدی تھے میں بھی تو خلافت والوں میں سے ایک تھا اس لیے مجھے ان کے پاس نہ پہنچایا گیا اور مجھے اکیلے ہی ایک چکی یعنی قید تنہائی کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا ان چکیوں میں بہت سے سکھ قیدی تھے اور وہ اس وجہ سے بند کیے گئے تھے کہ وہ ''ست سری اکال'' کے نعرے لگاتے تھے۔ سکھوں مین ایک بہت زبردست جذبہ پیدا ہو گیا تھا ان پر جتنی زیادہ سختی جیل والوں کی طرف سے کی جاتی تھی ان کا جذبہ بھی اتنا ہی زیادہ بڑھتا جاتا تھا۔ جب خلافت والوں کو میرے حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے شور مچا دیا اور دوسرے دن ہی مجھے چکی سے نکال لیا گیا اور انہیں سیاسی قیدیوں کے ساتھ یک جا کر دیا۔ اس جگہ آغا صفدر' ملک لال خان' لالہ لاجپت رائے اور اسی طرح کے بہت سے کانگریسی رہنما موجود تھے مجھے ان سب کے ساتھ تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ آغا صفدر' ملک لال خاں اور میں نے قرآن کا درس شروع کر دیا لیکن ملک لال خان نے بہت جلد ہمارے ساتھ اس درس میں شرکت ترک کر دی کیونکہ وہ کہتا تھا کہ لوگ قرآن کے

مختلف معنی نکالتے ہیں اور وہ بے چارے لکیر کے فقیر تھے ان میں اتنی سوجھ بوجھ اور علم نہ تھا کہ ہمارے سمجھانے کا ان پر کچھ گہرا اثر ہوتا۔

کچھ دنوں کے بعد ڈینٹل سرجن آیا مجھے اس کے پاس دفتر میں لے جایا گیا اس کا نام پریم ناتھ تھا۔ واللہ واقعی وہ پریم کا مجسمہ تھا اس نے میرے دانت دیکھے اور ان میں سے ایک دو دانت نکال دیے اور باقی دانتوں کو صاف کر دیا اس نے مجھے بتایا کہ یہ پائیوریا ہے اور خراب خوارک کی وجہ سے تمہارے دانتوں کو لگا ہے دوائی اور خوراک بھی اس نے مجھے لکھ دی میں نے اسے کہا کہ میں امیر آدمی ہوں اور میرے روپے جمع ہیں مہربانی کر کے تم اپنی فیس لے لو لیکن وہ فیس لینے سے برابر انکار ہی کرتا رہا جب میں نے اس سے بہت اصرار کیا تو اس نے مجھے کہا کہ آپ نے کون سا گناہ کیا ہے؟ آپ تو ملک وملت سے محبت اور خدمت کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں اس لی اگر میں آپ سے فیس لوں گا تو مجھے شرم نہیں آئے گی کیا؟ اگر میں آپ کی طرح اس قدر قربانی نہیں دے سکتا تو یہ تھوڑی سی خدمت تو کر سکتا ہوں۔ قصہ کوتاہ اس نے مجھ سے فیس وغیرہ کچھ نہ لیا اور اپنا بیگ اٹھا کر چلا گیا۔

میں کچھ دن کے بعد پھر ڈیرہ غازی خان کے جیل خانے میں بھیج دیا گیا۔ ریل گاڑی میں پولیس کی حفاظت میں سفر شروع ہوا گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کا وقت گرمی کے مارے برا حال ہو رہا تھا گاڑی شیر شاہ اسٹیشن پر رکی تو وہاں اتار لیا گیا۔ یہاں ہمیں گاڑی بدلنا تھی پولیس کا وہ افسر جو میری گارڈ کا انچارج تھا بہت اچھا آدمی تھا وہ مجھے ویٹنگ روم کی طرف لے گیا روم کے دروازے بند تھے پولیس افسر نے ایک

کرسی اٹھائی اور میرے آگے رکھ دی میں اس پر بیٹھ گیا پولیس افسر نے مجھے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔

پیر صاحب کا ایک مرید ان کے لیے ہاتھ سے پنکھا جھل رہا تھا اور ہمارے آ جانے سے پیر صاحب کی نیند کھل گئی۔ پیر صاحب نے یہ سارا تماشہ دیکھ لیا تھا پیر صاحب کو یہ مغالطہ ہو گیا تھا کہ میں شاید پولیس کا کوئی بہت بڑا افسر ہوں پیر صاحب کے ساتھ ان کا ایک معصوم بچہ بھی تھا۔ یہ پیر صاحب ہندوستان میں خیرات و صدقے جمع کرنے کے لیے گئے تھے اور بہت سے صندوق مال و اسباب سے بھر کر لاء تھے وہ تونسہ شریف کے بڑے پیر تھے۔ مجھے ننھے بچوں سے بے حد پیار و محبت ہے اور اس معصوم بچے کا بھی مجھ سے پیار ہو گیا وہ میرے پاس بیٹھ گیا تو ملنے کا نام ہی نہ لیا پیر صاحب پہلے تو بڑے خوش تھے کہ میں شاید پولیس کا ایک بڑا افسر ہوں لیکن بعد میں جب میں باہر نکلا اور وہ بچہ میرے بھی ساتھ آ گیا تو لوگوں نے مجھ ید یکھا اور پہچان لیا۔ پھر کیا تھا بھاری تعداد میں میرے ارد گرد لوگ جمع ہو گئے تب پیر صاحب کو معلوم ہوا کہ میں تو خلافت کا آدمی ہوں پھر کیا تھا پیر صاحب نے فوراً اپنا ایک مرید اپنے ننھے بچے کو لے جانے کے لیے ہمارے پیچھے بھیج دیا لیکن وہ بچہ کہاں مجھ سے جدا ہونے لگا تھا آخر اسے رلا کر ہی مجھ سے جدا کیا گیا بچے کو لے کر پیر صاحب ویٹنگ روم چھوڑ کر چل دیے۔

ڈیرہ غازی خان لا کر مجھے جیل کی ایک بارک میں بند کر دیا گیا اس بارک میں مسلمان بہت تھوڑے تھے ہندو اور سکھ بہت زیادہ تھے ہمارا ایک ماسٹر تھا اس کا نام

گوردتہ مل تھا بہت اچھا آدمی تھا اور میرے ساتھ تو اس کی گہری محبت تھی جب وہ پرارتھنا کیا کرتا تھا تو شانتی شانتی کا پاٹھ خوب کرتا تھا لیکن وہ خود شانت نہیں تھا۔ معمولی سی بات پر بہت بگڑ جاتا تھا سکھ جب سب اکٹھے ہو جاتے تھے تو یہ شبد بڑے شوق سے گاتے تھے ''سر جاوے تاں جاوے میرا سکھی دھرم نہ جاوے'' یہ سن کر مجھے بہت لطف آتا تھا میں کہتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نسب سکھوں میں یہ جذبہ اس وجہ سے فراواں ہے کہ ان کی مذہبی کتاب اپنی مادری زبان میں ہے اور وہ الفاظ کا معانی کما حقہ اثر حاصل کر سکتے ہیں نیز اسی وجہ سے وہ اپنے مذہب کی فضیلت اور عبادت سے بھی خوب واقف ہیں اور ہم ہندو اور مسلمان جس زبان میں عبادت کرتے ہیں اسے ہم نہیں سمجھتے۔ ہندوؤں کی عبادتی زبان سنسکرت اور ہماری عربی ہے یہی وجہ ہے کہ نہ تو ہم اپنے عبادتی کلام کے معنی ومفہوم کو سمجھ پاتے ہیں اور نہ ہندو لوگ۔ اب غور کیجیے کہ ایک آدمی جو اپنے مذہب سے واقف نہیں ہے اور نہ ہی مذہبی کلام کو سمجھتا ہے وہ کیا ترقی کرے گا؟

اس جیل خانے میں ہمارے دن بڑے اچھے گزر رہے تھے اور پختونوں کے بارے میں انگریزوں نے جو بہت سی غلط فہمیاں ہندوؤں کے دلوں میں پیدا کر رکھی تھیں ان کی کسی قدر اصلاح ہوگئی ایک دن میرا ایک ہندو دوست مجھے کہنے لگا ''میں ایک بات آپ سے پوچھتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ خفا نہیں ہوں گے''۔

میں نے جواب دیا ''ہرگز نہیں''

''ہندو دوست نے کہا ''میں نے سنا ہے کہ پٹھان انسان کا خون پیتے ہیں؟''

میں نے جواب دیا ''ہاں ہاں خوب پیتے ہیں''۔

وہ چلا سا اٹھا ''باپ رے باپ''س نے پھر پوچھا ''یہ کیوں پیتے ہیں؟''

میں نے جواب دیا'اس لیے کہ یہ بہت ہی لذیذ ہوتا ہے''۔

وہ پھر چلا اٹھا ''باپ رے باپ''۔

میں نے اب ذرا سنجیدہ لہجے میں ہندو سے پوچھا ''دوست! یہ بات تمہارے دماغ مٰیں پیدا کیسے ہوئی؟ کیا تم کبھی پٹھانوں کے دیش میں گئے ہو تم نے پٹھان دیکھے بھی ہیں'تمہارا ان سے کبھی واسطہ پڑا ہے؟''

اس نے جواب دیا ''نہیں''۔

میں نے اس سے پھر پوچھا ''تو پھر تم کیسے اس نتیجہ پر پہنچ گئے؟''

اس کا جواب تھا کہ ''اس نے کسی کتاب میں پڑھا ہے''۔

کچھ دنوں کے بعد ہمیں خبر ملی کہ محکمہ جیل کا جرنیل دورے پر آرہا ہے اس کا نام کرنل واڈ تھا۔ یہ بڑا سخت طبیعت کا آدمی تھا اور اس کا قوم پرستوں سے تو کد اواسطے کا بیر تھا غرضیکہ ہر لحاظ سے بڑا خراب آدمی تھا جس وقت وہ اس جیل خانہ کا معائنہ کرتا ہوا ہماری بارک میں داخل ہوا اور اس نے ہندوؤں کے سروں پر ٹوپیاں اور سکھوں کے سروں پر کالی پگڑیاں دیکھیں تو آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ داروغہ پر برس پڑا ''اس چیز کی اجازت تم نے انہیں کیوں دی ہے؟''

ہمارا سپرنٹنڈنٹ اچھا آدمی تھا وہ بھی انگریز ہیت تھا اس نے جرنیل سے کہا کہ ''یہ ان کا نہیں میرا قصور ہے''۔

جرنیل چلا گیا اور جیل کے افسروں کو حکم دے گیا کہ وہ ان قیدیوں سے گاندھی ٹوپی اور ''کالی دستاریں'' لے لیں۔

دوسرے دن جب سپرنٹنڈنٹ اور داروغہ آئے تو ہمیں جرنیل کا یہ حکم دنایا گیا سردار کھڑک سنگھ نے ان سے کہا ''ہم اسپیشل کلاس کے قیدی ہیں اور حکومت نے ہمیں اپنے کپڑے پہننے کی اجازت دے رکھی ہے اس لیے یہ ہماری مرضی پر منحصر ہے کہ جس طرح کے کپڑے ہمیں پسند ہوں ویسے ہی کپڑے ہم پہنیں لہٰذا جرنیل صاحب کا یہ حکم ناجائز ہے اور ہمارے ان حقوق میں جو حکومت نے ہمیں دے رکھے ہیں بے جا مداخلت ہے''

لیکن اس بات پر انہوں نے کان نہ دھرے انہوں نے کہا ''ہم تو مجبور ہیں ہم لوگ جرنیل صاحب کے حکم کی تعمیل کریں گے لہٰذا ہم تم کو حکم دیتے ہیں کہ یہ ٹوپیاں اور پگڑی اتار لو''۔

ہم نے ان سے مزید دلیل بازی نہ کی کیونکہ وہ دلیل کو نہیں مانتے تھے جب یہ لوگ چلے گئے تو ہم سب ایک جگہ بیٹھ گئے اور آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ حکومت نے چونکہ ہمیں اپنے کپڑے پہننے کا حق دیا ہے تو یہ ہماری مرضی ہے کہ جس طرح کے کپڑے پہننے کو ہمارا دل چاہے ہم اسی قسم کے کپڑے پہنیں اور یہ کہ جیل والوں کا یہ حکم جائز نہیں ہے کہ اس لیے ہم اسے نہیں مانیں گے اور ٹوپیاں اور پگڑیاں نہیں اتاریں گے''۔

دوسرے دن جیل کے افسران آئے ایک ایک آدمی کو دفتر لے جانے لگے اور

وہاں ان کی ٹوپیاں اور پگڑیاں سر سے ہٹانے لگے اوس طرح ہم سب کی جب ٹوپیاں اور پگڑیاں سروں سے اتروالی گئیں تو ہم نے فیصلہ کیا کہ یہ باقی کپڑے بھی ہم نہیں پہنتے ہم چاہے ہندو تھے یا مسلمان یا کہ سکھ تھے سب نے اپنے اپنے کپڑے اتار لیے اور ننگے ہو گئے اور لنگوٹیاں کس لیں۔اس موقع میر میں نے ان کی خدمت میں یہ عرض کی یہ کہ ٹوپی اور پگڑی کا قضیہ مارے صوبے میں نہیں ہے اور اس کا کوئی خاص اثر ہمارے لوگوں پر نہیں پڑتا۔اس لیے آپ لوگ اگر کہیں تو آپ لوگوں کی خاطر میں بھی اس تحریک میں شامل ہو جاتا ہوں لیکن انہوں نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی اور کہہ دیا کہ ''یہ ہمارا پنجاب کا معاملہ ہے اور یہ تحریک ہم نے پنجابی ہی چلائیں گے۔

کچھ دنوں کے بعد ڈیرہ غازی خان کا ڈپٹی کمشنر جیل خانے میں آیا اور اس کا نام ولسن تھا ہم سب کی طرف سے اس کے ساتھ سردار کھڑک سنگھ نے گفت وشنید کی۔ سردار صاحب نے اسے کہا کہ ''یہ ہمارا حق ہے کہ جب ایک دفعہ حکومت نے ہماری مرضی کے مطابق ہمیں کپڑے پہننے کا حق دیا ہے تو پھر یہ ہماری مرضی پر منحصر ہے کہ جس قسم کے کپڑے ہم چاہیں پہن لیں''۔

ڈپٹی کمشنر نے کہا ''تمہیں پگڑی اور ٹوپی کا حق نہیں ہے''۔

سردار صاحب نے پوچھا ''کیوں؟ کیا یہ پگڑیاں کپڑوں کی تعریف میں نہیں آتیں؟''

ڈپٹی کمشنر نے جواب دیا ''نہیں''۔

اس گفت وشنید میں اہستہ آہستہ تلخی سی پیدا ہو گئی تو اچانک سکھوں نے نعرہ لگا دیا ''جو بولے سونہال ست سری اکال''۔

اس نعرے سے فضا کانپ اٹھی ڈپٹی کمشنر پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر دفتر کی طرف بھاگا اور دفتر میں جا کری حکم تحریر کر دیا کہ اس بات کے لیے انہیں سزا دینی چاہیے۔

دوسرے دن سپر نٹنڈنٹ آیا اور اس نے ہمیں یہ حکم سنایا ''تم لوگ کپڑے پہن لو اگر کپڑے نہیں پہنو گے تو کل تمہیں جیل خانے کے آئین کے مطابق مقدمے میں ماخوذ کیا جائے گا''۔

☆☆☆

ولی اور غنی کی میری رہائی کے لیے تحریک

میں سی کلاس میں تھا اور سی کلاس کے قیدیوں کو تین ماہ بعد ایک ہی خط لکھنے کی اجازت ہوا کرتی تھی اسی طرح تین مہینے کے بعد اس کے نام جیل خانے میں جو خط آتا تھا وہ اسے دیا جاتا تھا ایسی حالت میں اپنے علاقے کے حالات سے بہت کم باخبر ہوتا تھا۔ اسی طرح تین ماہ کے بعد ایک قیدی کی اپنے لواحقین سے ملاقات ہوا کرتی تھی ۔ ان حالات میں جو بھی میری ملاقات کو آتا وہ مجھے اپنے صوبے کے حالات سناجاتا ہماری جماعت نے اپنے علاقے میں زوروشور سے کام شروع کرر کھا تھا ان دنوں جلسوں کا زیادہ رواج نہیں تھا اور حکومت بھی کسی کو جلسوں میں نہیں جانے دیتی تھی لوگ بھی ڈرتے تھے۔ ان حالات میں ہمارے ساتھی مسجدوں میں مجالس ہائے مولود شریف منعقد کرتے تھے اور انہی مجالس میں ہمارے کارکن تقریریں کیا کرتے تھے اور اس میں زیادہ تر حصہ لینے والے ہمارے سکول کے طلباء ہوا کرتے تھے ۔ اس وقت غنی کی عمر نو سال کی تھی ولی بہت اچھی قرات کرتا تھا اور وہ ایک بہت بڑا اچھا قاری تھا۔ غنی ایک بہت اچھا مقرر تھا اور بڑی شاندار تقریر کیا کرتا تھا اور وہ اپنی تقریر کے آخر میں لوگوں سے یہ کہا کرتا تھا کہ ''اے لوگو! آپ لوگ ذرا اس حکومت سے یہ تو پوچھیں کہ میرے باپ کو اس نے کس لیے قید کرر کھا ہے آ کر ان کا گناہ کیا ہے اوانہوں نے کیا جرم کیا ہے؟'' ہمارے لوگوں پر ان باتوں کا بڑا اثر پڑتا تھا لہذا وہ بڑے متاثر ہوئے اور ملک میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی مختصر یہ کہ میری

قید سے میری قوم کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ایک تو ان میں تعلیم کا شوق پیدا ہو گیا اور دوسرا ان کے اندر سیاسی شعور آ گیا میری قید کی وجہ سے ہمارے سکول سے لوگوں کی بڑی ہمدردی اور محبت پیدا ہو گئی تھی اور وہ سکول کے لیے امداد بھی مہیا کر تے ۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

والدہ کا انتقال

میری والدہ صاحب میرے لیے بہت غمگین اور اداس رہتی تھیں اور جیل کے قواعد کے مطابق مجھے جب خط لکھنے کا موقع میسر آتا تو میں اپنی والدہ صاحبہ ہی کو خط لکھا کرتا تھا۔ میری والدہ صاحبہ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ میری ملاقات کے لیے آئیں، لیکن وہ ضعیف العمر تھیں اور ڈیرہ غازی خان ایک بہت دور افتادہ جگہ تھی اس کے علاوہ بیچ میں دریائے سندھ پڑتا تھا وہ اس قدر تکلیف دہ سفر تھا کہ جوان کیلیے نا قابل برداشت تھا۔ اس لیے میں ہمیشہ اپنی ملاقات کے لیے آنے سے منع کر دیا کرتا تھا لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ انہیں خداوند پاک نے مجھ سے جدا کر دے گا۔ ۱۹۳۲ء میں آخر میں وہ بیمار ہوئیں اور کچھ ہی دنوں کے بعد رحلت فرما گئیں۔ لیکن مجھے کسی نے بھی ان کی بیماری یا وفات کی اطلاع نہیں دی۔ اور مجھ سے یہ خبر چھپائی گئی لیکن مجھے اخبارات کے ذریعے علم ہو گیا اور میں بہت دکھی ہوا جب میں رہا ہو کر اپنے گاؤں میں آیا تو میری بہن نے مجھے بتایا کہ آخری سانس لیتے وقت ماں نے مجھے بہت یاد کیا۔ وہ حالت نزع میں کہہ رہی تھیں ''غفار کدھر گیا ہے وہ آیا ہے یا نہیں''؟ بس میرا ہی نام ان کی زبان پر تھا کہ انہوں نے دم توڑ دیا۔

☆☆☆

سردار کھڑت سنگھ ایک زبردست انسان

ڈیرہ غازی خان کے قیدیوں میں سب سے بڑی قید میری تھی میری قید تین سال کی تھی اور دوسرے قیدیوں میں سے کوئی چھ مہینے' کوئی نو مہینے اور زیادہ سے زیادہ سال بھر کے لیے قید تھا۔ چھ مہینے تک اکثر سزا یافتہ قیدی ہمارے دیکھتے دیکھتے رہا ہو چکے تھے اور یہ لوگ اس سے بھی پہلے رہا ہو جاتے اگر جیل خانے میں کپڑوں کا ایجی ٹیشن نہ ہوتا اور ان کی قید کا عرصہ بڑھایا نہ ہوتا جب ان کی نو مہینے کی قید پوری ہوگئی تو سپرنٹنڈنٹ پھر آیا تو ان سے کہنے لگا کہ اب بھی کپڑے پہن لو ورنہ پھر ایک مقدمہ تمہارے خلاف چلایا جائے گا۔ اس پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے تو کپڑے پہن لیے لیکن سکھوں نے پھر بھی نہیں پہنے۔ لہذا انہیں نو نو مہینے کی مزید قید کی سزائیں دی گئیں جن اصحاب نے کپڑے پہن لیے تھے انہوں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ انہیں اس جیل خانے سے منتقل کر دیا جائے انہیں اس جیل خانے سے کہیں اور بھیج دیا جائے۔ جب نو مہینے پورے ہو گئے اور سکھ سمجھ گئے کہ جیل خانے والے پھر ہمارے خلاف مقدمہ چلانا چاہتے ہیں تو ان میں بھی کمزوری پیدا ہوگئی اور انہوں نے بھی کوشش کی کہ وہ اس جیل خانے سے اپنے آپ کو منتقل کروالیں انہیں بھی دوسرے جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

اب اس جیل خانے بس صرف میں اور سردار کھڑک سنگھ دو ہی قیدی رہ گئے تھے۔ کھڑک سنگھ بڑا زبردست انسان تھا اور پہاڑ کی طرح اپنے عزم پر ڈٹا ہوا تھا

کوئی اسے ہلا نہیں سکتا تھا اس دوران جرنیل پھر دورے پر آیا اور جونہی وہ ہماری بارک میں پہنچا تو بڑے تکبر سے بھرپور تھا اسنے سردار صاحب سے کہا ''ویل کھڑک سنگھ''۔

سردار کھڑک سنگھ نے جواب دیا ''یس واڈ''

یہ ن کر انگریز جل بھن گیا جب وہ چلا گیا تو حکم دے گیا ''کھڑک سنگھ کو چکی میں بند کر دو اور کمزوری کے پیش نظر ڈاکٹر نے جو دودھ اس کے لیے مقرر کر رکھا ہے اسے بھی دینا بند کر دیا جائے''۔

جیل کے حکام سردار صاحب کو وہاں سے لے گئے ہسپتال میں ایک چکی تھی۔ اس میں انہیں بند کر دیا گیا۔ میں اکیلا ہی رہ گیا۔ ہسپتال میری بارک سے ملحق تھا اور وہاں دروازے میں ایک سوراخ تھا میری سردار صاحب کی ملاقات کبھی نہ کبھی اسی سوراخ میں سے ہو جایا کرتی تھی سردار صاحب بہت کمزور ہو گئے تھے میں انہیں اسی سوراخ میں سے کبھی کبھی کھانے کی چیزیں دے دیتا لیکن وہ ایک عظیم انسان تھا باوجود اس قدر مصائب اور تکالیف کے اس عزم اور غیرت میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آئی تھی۔

جیل کے افسران نے حکام بالا کو رپورٹ کر دی کہ میں نے جیل کی ایک بڑی بارک گھیر رکھی ہے اور چونکہ میں اس جیل خانے میں قیدیوں کی تعداد بڑھ گئی ہے اس لیے انہیں بارک کی ضرورت ہے لہذا مجھے اس جگہ سے کسی دوسری جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

اس جیل خانے میں صرف دو بارکیں تھیں ایک میں میں قید تھا اور چھوٹی بارک ان کے پاس تھی' مطلب یہ کہ قیدیوں کی تعداد کے مقابلے میں جگہ کم تھی اس لیے مجھے میانوالی کے جیل خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ میانوالی کا جیل خانہ بھی چھوٹا سا ہے اس میں بارکیں نہیں ہیں سب چکیاں قید تنہائی کی کوٹھریاں ہیں۔ یہاں بھی کافی سیاسی قیدی تھے کانگریس والے بھی تھے اور خلافت والے بھی گورو کے باغ کے قیدی بھی تھے لیکن یہ قیدی ڈیرہ غازی خان کے قیدیوں میں سے یہاں منتقل کیے گئے تھے اور ان کے جیل والوں سے اچھے تعلقات تھے اس جگہ ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کے علیحدہ علیحدہ لنگر تھے۔ ہمارے لنگر کے انچارج مولاان اقبال تھے یہ حضرت پانی پت کے رہنے والے تھے اور خلافت تحریک میں پانچ سال سے قید تھے کھانا پکانے میں بڑے ماہر تھے لیکن ہانڈی میں مرچ بہت زیادہ ڈالتے تھے اور میرے لیے ایک بہت بڑی مصیبت پیدا کر دیتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان کالڑکا اختر علی خاں بھی ہامرے ساتھ تھا اس جگہ کا داروغہ بھی عجیب انسان تھا۔ میانوالی میں سخت گرمی پڑتی تھی اور ریت بھی اڑتی ہے جیل خانے میں ایک کنواں تھا اسکا پانی بہت ٹھنڈا تھا داروغہ صاحب سیاسی قیدیوں کو نہلانے کے لیے وہاں لے جایا کرتا تھا۔ مجھے بھی وہ بہت کہا کرتا تھا کہ لیکن میں نہیں جاتا تھا اور شام کو جب گنتی بند کی جاتی تھی تو جیل خانے کے درمیان میں ایک برج تھا جس کے چاروں طرف بیٹھنے کی جگہ تھی داروغہ صاحب وہاں بیٹھا کرتا تھا اور ہمارے سیاسی قیدی بھی وہاں جا کر بیٹھتے تھے اس جگہ کے لیے مجھے بھی کہا جاتا تھا لیکن کیونکہ ان جیل کے افسروں کی ساری زندگی

اگر چہ قیدیوں کے ساتھ گزری ہوتی ہے لیکن افسر آخر افسو ہی ہوتا ہے علاوہ ازیں افسروں کے مزاج بڑے عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک دن اختر علی خان اور کچھ دیگر سیاسی قیدی داروغہ صاحب کے ساتھ اس جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے اس اثناء میں جیل خانے کا ڈاکٹر آپہنچا۔ وہاں جتنی کرسیاں تھیں وہ سب سیاسی قیدیوں نے گھیری ہوئی تھیں ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ سیاسی قیدی نہ تو اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے اور نہ ہی اس کے لیے کوئی کرسی خالی کی۔ اس پر داروغہ نے ان کی بہت بے عزتی کی اور ان سے کرسیاں خالی کرائیں اور انہیں وہاں سے چلتا کیا سیاسی قیدیوں کی اس بے عزتی سے میرے دل کو بہت رنج پہنچا لیکن مجھے ایسا لگا کہ ان سیاسی قیدیوں نے خود کوئی پرواہ نہیں کی تھی کیونکہ دوسرے ہی دن میں نے دیکھا کہ وہ پھر دروازے کے ساتھ کھڑے ہیں اور سپاہی کہہ رہے ہیں کہ وہ داروغہ صاحب سے ان کے لیے وہاں جانے کی اجازت مانگے۔

۱۹۲۴ء کو میری قید کی معیاد ختم ہونے میں چند دن باقی رہ گئے تھے کہ داروغہ صاحب نے آکر اطلاع دی کہ مجھے پشاور منتقل کرنے کے احکام جاری ہوئے ہیں اور وہ مجھے لینے کے لیے پولیس آگی ہے اور دروازے پر بیٹھی ہے۔ داروغہ کے کہنے پر میں نے اپنا سامان اٹھایا اور دروازے کی طرف چلا گیا وہاں سے جیل کے ملازمین مجھے اسٹیشن پر لے گئے اور سفر شروع ہوا جب گاڑی خیرآباد پہنچی تو مجھے گاڑی سے اتار لیا گیا۔ اور پشاور کی پولیس نے مجھے موٹر میں بٹھایا موٹر جو روانہ ہوئی تو مردان کے اس طرف پنکچر ہوگئی اور پولیس پر بڑی ہیبت چھاگئی اس نے موٹر چھوڑ دی ایک تانگہ

پکڑ لیا اور مجھے چارسدہ لے آئے اور وہاں کے اسسٹنٹ کمشنر کے سامنے مجھے پیش کر دیا اور اس وقت چارسدہ کا اسسٹنٹ کمشنر دلاور خان تھا اس نے پولیس کو حکم دیا کہ وہ مجھے لے جائے اور میرے گاؤں میں پہنچا کر رہا کر دے۔

اس حکم کے مطابق پولیس مجھے میرے گاؤں لے آئی اور ہمارے مدرسے کے قریب چھوڑ کر چلی گئی۔ لڑکوں کی چھٹی کا وقت تھا انہوں نے جونہی مجھے دیکھا تو دوڑ کر سب میرے پاس آگئے اور میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ لیکن میرے گاؤں میں آج کے دن میری رہائی متوقع نہیں تھی کیونکہ اصل میں سرکار نے چند دن پہلے ہی ڈرامائی انداز میں مجھے رہا کر دیا۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی کہ ہمارے گاؤں والوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ میں جب مقررہ دن پر رہا کیا جاؤں گا تو وہ میرے استقبال کے لیے اٹک جائیں گے اور اس جگہ سے مجھے جلوس کی شکل میں اپنے گاؤں میں لے آئیں گے اس لیے انہوں نے گھوڑوں کا بڑا انتظام کیا تھا لیکن حکومت اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ اس سے ہمارا بہت بڑا پروپیگنڈہ ہو جاتا۔ لہٰذا حکومت نے مجھے چند روز قبل ہی رہا کر دیا اور چپکے سے میرے گاؤں میں لا کر مجھے چھوڑ دیا گیا۔

تین سال بعد میں جیل خانے سے رہا ہوا تھا۔ ان تین سالوں میں ہماری قوم بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ ہمارے مدرسے نے اچھی ترقی کر لی تھی اور اس کامیابی کا تمام سہرا ہمارے اسکول کے لڑکوں اور استادوں کے سر پر تھا انہوں نے میرے قید ہو جانے کے بعد ملک میں بڑا کام کیا تھا گویا میری قید کا صحیح فائدہ اٹھایا تھا یہ سب ان لوگوں کی محنت کی برکت تھی

ہمارے سکول کا سالانہ جلسہ قریب تھا اور میرے آ جانے کے باعث انہوں نے تاریخیں قدرے آگے ڈال دیں۔ خیر جلسہ بڑے اہتمام سے ہوا اس میں ہزاروں لوگ شامل ہوئے اور لوگوں میں بہت پریم پیار اور جوش وخروش تھا جلسے میں کافی تقریریں ہوئیں اور نظمیں بھی پڑھی گئیں اس موقع پر قوم کی طرف سے مجھے ایک تمغہ عطا کیا گیا اور فخر افغان کے لقب سے میرے عزت افزائی کی گئی میں نے اس جلسے میں ایک مختصر سی تقریر کی اور اپنی قوم کو میں نے ایک شیر کے بچے کا یہ قصہ سنایا۔

''ایک شیرنی تھی اس نے بھیڑوں کے ریوڑ پر حملہ کر دیا وہ حاملہ تھی' حملہ کے دوران اس کے بچہ پیدا ہوا اور وہ خود مر گئی اور اس کا یہ بچہ ای بھیڑ نے اپنے پیچھے لگا لیا شیر کا یہ بچہ انہی بھیڑوں کے ریوڑ میں پلا اور بڑھا ہوا اس نے بھیڑوں کی عادتیں اور خصلتیں سیکھ لیں۔وہ بھیڑوں کے ساتھ ہی گھومتا پھرتا اور چرتا رہتا ایک دن ایک شیر ادھر آ نکلا اور اس نے بھیڑوں پر حملہ کر دیا حملے کے وقت شیر نے دیکھا کہ ان بھیڑوں میں ایک شیر کا بچہ بھی ہے اور وہ بھی اس سے ڈر کر بھیڑوں کے سات بھاگا جا رہا ہے۔ اور بھیڑوں کی مانند بائیں بائیں کر رہا ہے حملہ آور شیر کو یہ بات بہت عجیب نظر آئی کہ کہاں شیر کا بچہ اور کہاں یہ بائیں بائیں اور بھیڑ کا سا ڈرپوک پن۔وہ شیر کے بچے کے قریب آیا اور اس نے شیر کے بچے کو بھیڑوں سے علیحدہ کر لیا پھر اسے ایک تالاب پر لے گیا تا کہ وہ پانی کے اندر اپنا منہ دیکھ لے اور اسے معلوم ہو جائے کہ وہ بھیڑ نہیں بلکہ شیر ہے۔شیر کے بچے نے جب پانی میں اپنا عکس دیکھا تو اس سے حملہ آور شیر نے کہا''ارے کیا دیکھتا ہے تو بھیڑ نہیں شیر ہے بیں بیں مت کر

شیر کی دھاڑ پھر کیا تھا اس شیر کے بچے کی غلط فہمی دور ہو گئی اور وہ زور زور سے شیر کی طرح دھاڑنے لگا جنگل کانپ اٹھا۔ اور بھیڑوں کے ریوڑ تو کیا دیگر بڑے بڑے جانوروں میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔

یہ قصہ سنا کر میں نے گرج کر کہا ''اے پختونو میں بھی تمہیں یہی کہتا ہوں کہ تم بھیڑیں نہیں ہو' تم شیر ہو شیر۔ غلامی میں پلنے کی وجہ سے تم اپنی حقیقی طاقت کو بھول گئے ہو۔ اپنے آپ کو پہچانو بیں بیں مت کرو اور شیروں کی طرح گرجو'' میری اس تقریر سے حکومت بہت سٹپٹائی مگر میری قوم بہ مسرور ہوئی اور اسپر اس کا جادو کی طرح اثر ہوا۔ جلسہ برخاست ہو گیا لیکن میری تقریر ہمیشہ لوگوں کے کانوں میں گونجتی رہی۔

☆☆☆

دوسری بیوی کا انتقال

مئی ۱۹۲۶ء میں میری بہن حج کو جا رہی تھی۔ اس نے مجھے بھی مجبور کیا کہ میں بھی اس کے ہمراہ حج کو جاؤں۔ چنانچہ میں نے اور میری بیوی دونوں اس کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ کراچی سے آگے ہم نے سمندری جہاز سے سفر شروع کیا۔ ہم نے بڑی کوشش کی لیکن ہمیں فرسٹ یا سیکنڈ کلاس کی ٹکٹ نہ مل سکے کیوں کہ وہ سب لوگوں نے پہلے ہی کر لیے تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ اور تھرڈ کلاس میں بھی بے شمار حاجی سوار تھے۔ جب جہاز کراچی سے دور نکل گیا تو ہمیں قے آنی شروع ہوگئی اور کامران تک ہم لوگ کوئی چیز بھی زبان پر نہ رکھ سکے۔ کامران میں جب جہاز ٹھہرا اور ہم جہاز سے نیچے اترے تو قدرے کھانے پینے کا جی چاہا اور ہم نے کھایا پیا رات کو ہم نے وہاں گزار دی اور دوسرے دن جہاز آگے روانہ ہوا اب مجھے انفلوئنزا ہو گیا خدا ایک عرب باشندے کا بھلا کرے کہ وہ مجھے اپنی سیکنڈ کلاس میں لے گیا اور مجھے اپنی ہی جگہ پر سلا دیا۔ اس نے میری بڑی حفاظت کی۔ جب ہم جدہ پہنچ کر جہاز سے نیچے اترے تو اس وقت تک میں ویسا ہی بیمار تھا معلم ہمیں اپنی جگہ پر لے آیا۔ ہمارے ساتھ سامان بہت زیادہ تھا۔ معلم کی بے پروائی سے جہاز میں رہ گیا اور گم ہو گیا۔ اسی نے ہی چرا لیا۔

جدے سے دوسرے دن ہم مکے چلے گئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ اور مکہ میں بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ اور ہمارے لیے یہ بات سخت مصیبت کا باعث تھی کہ دن بڑا

سخت گرم ہوتا تھا اور رات کے وقت ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ اس سے بے چارے حاجی بہت بری طرح بیمار پڑ جاتے تھے۔ اور اکثر مرتے رہتے تھے۔ اس سال سعودیوں نے مکہ پر قبضہ کر لیا تھا اور شریف مکہ کو بھگا دیا تھا۔ سعودیوں نے عنان حکومت کو خوب اچھی طرح سنبھالا اور ہر طرح امن و امان قائم ہو گیا۔ حاجی بتاتے تھے کہ جس وقت شریف مکہ کی حکومت تھی اس وقت ملک میں بڑی بدامنی تھی۔ حاجیوں کے قافلے لوٹ لیے جاتے تھے اور اس لوٹ میں شریف مکہ خود لٹیروں کے ساتھ حصہ دار ہوا کرتا تھا۔ اس سال سعودیوں نے محمد علی، شوکت علی، اور ظفر علی خان وغیرہ اور ہندوستان کے دوسرے بہت سے لیڈروں کو دعوت دی تھی اور ہندوستان سے بہت سے لیڈر وہاں پہنچتے تھے۔ اس سال دنیا بھر کے مسلمانوں کا ایک موتمر بھی ہوا کرتا تھا۔ اور میں بھی اس میں شامل ہوا تھا لیکن اس سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ تمام بحث و مباحثہ قبوں اور رجبوں تک ہی محدود تھا۔ بلکہ اس موتمر نے لوگوں میں اور زیادہ اختلافات پیدا کر دیے تھے۔

ہم حج سے فارغ ہو گئے۔ میری بہن مدینے چلی گئی اور وہاں سے اپنے وطن کو لوٹ گئی۔ لیکن میری طبیعت اسی طرح علیل تھی۔ چنانچہ میں اور میری بیوی طائف چلے گئے۔ طائف حجاز میں ایک خوشگوار اور سرد مقام ہے طائف کے تمام بنگلے جو ترکوں نے بنائے تھے وہ ویران پڑے تھے۔ ہمارا نصیب اچھا تھا۔ کیوں کہ جب ہم طائف جا رہے تھے تو راستے میں ایک پٹھان ہمارا ہم سفر ہو گیا۔ اس کا گھر طائف میں ہی تھا۔ ہم اس کے ساتھ چلے گئے۔ اسے اور اس کی اہلیہ کو تو پشتو آتی تھی۔ لیکن اس کے

بچوں کو پشتو نہیں آتی تھی۔ اس کا گھر بہت خوب صورت تھا۔ ہم نے اس کے ساتھ کچھ دن گزارے اور بعد میں مکہ واپس آ گئے۔

طائف میں ایک واقعہ جو مجھے درپیش آیا قابل ذکر ہے۔ ایک دن شہر میں سے باہر نکلا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی جو دراز ریش ہے اور ایک لمبا جبہ پہنے ہوئے ہے مجھے آوازیں دے رہا ہے۔ ''اے شیخ تعال تعال یعنی ادھر آؤ''۔

میں اس کے قریب چلا گیا تو اس نے مجھ سے کہا ''یہاں رسول اللہ کی داڑھی کا ایک بال پڑا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایک پتھر بھی پڑا ہے جس پر رسول اللہ کے پاؤں کا نشان ہے''۔

میں نے اسے جواب دیا ''میں یہاں اس لیے نہیں آیا ہوں بلکہ میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ میں اس رسول پاک کا وہ صبر اور ہمت دیکھوں کہ وہ مکے سے ان دشت بیابانوں میں لوگوں کے بھلے کے لیے یہاں طائف میں آتے ہیں اور طائف کے لوگ انہیں پتھر مارتے ہیں ان کے پیچھے کتے لگاتے ہیں۔ انہیں زدوکوب کرتے ہیں اور وہ ان سب زیادتیوں کے باوجود اپنی قوم سے مایوس نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے لیے دست بہ دعا ہوتے ہیں کہ ''خدایا تو میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ نیکی کے راستے پر چلے''۔

میرا یہ جواب سن کر وہ دراز ریش آدمی کچھ نہ کہہ سکا۔ خاموش ہو کر رہ گیا۔

مکہ پہنچ کر ہم نے کچھ دن وہاں گزارے پھر جدے چلے آئے۔ جدے میں کچھ دن گزارنے کے بعد ہم لوگ مدینے چلے آئے۔ ہمارا سارا قافلہ چار عورتوں اور چھ

مردوں پر مشتمل تھا۔اس زمانے میں موٹریں نہیں ہوا کرتی تھیں۔اور سفر اونٹوں کے ذریعے ہوا کرتا تھامنزل رات کو طے کی جاتی تھی۔چاروں طرف دشت و بیابان تھے کچھ نجدیوں کی وجہ سے وہاں ایسا امن تھا کہ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

مدینے پہنچ کر ہم نے وہاں بھی کچھ دن گزارے اور وہاں سے ہم نے بیت القدس جانے کا عزم کیا۔اور ہم مدینے سے رابغ چلے گئے یہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے تیسرے دن جہاز آیا۔ہم لوگ اس میں بیٹھکر اور سویز کے مقام پر اتر گئے۔سویز سے ہم بذریعہ ریل گاڑی بیت المقدس پہنچ گئے۔ بیت المقدس میں میری اہلیہ سیڑھیوں سے گر پڑی اور جاں بحق ہوگئی۔وہ اپنے پیچھے دو بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑ گئی۔ مجھے اس کی جدائی کا بڑا صدمہ ہوا۔کیوں کہ وہ میری رفیقہ حیات تھی۔اور اس کے بعد میں نے پھر شادی نہیں کی۔حالانکہ میں جوان تھا۔اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے دل میں ملک وملت کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا اور میں شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔کچھ دن میں نے فلسطین میں گزار دیے اور اس جگہ کے مشہور مقامات دیکھے۔پھر اس جگہ سے میں نے لبنان‘ شام‘ اور عراق کی سیاحت کی۔نجف و کربلا کی زیارت بھی کی اور بغداد میں چند دن گزارنے کے بعد میں بصرے چلا گیا اور بصرے سے جو جہاز میں سوار ہوا تو کراچی آ کر اترا۔لیکن اس میں اور حاجیوں کے جہاز میں بڑا فرق تھا۔جس پر ہم کراچی سے جدے جاتے ہوئے سوار ہوئے تھے۔اس میں بہت تکلیف اور اس میں بڑا آرام تھا۔کراچی میں میں نے چند گزارے اور وہاں سے واپس اپنے گاؤں میں آ گیا۔

''پشتون'' کا اجراء

ہمارے صوبہ میں ایک بھی قومی اخبار نہیں تھا۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ پختونوں کے لیے ان کی اپنی زبان میں ایک پشتو اخبار جاری کیا جائے جو صحیح معنوں میں قومی اخبار ہو اور قوم کی ملکیت ہو۔ اس مقصد کے لیے بڑی جدوجہد کے بعد مئی ۱۹۲۸ء میں میں نے اپنے اس عزم میں کامیاب ہوا۔ ''پشتون'' کے نام سے میں نے اخبار شائع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب پختونوں کو اپنی زبان سے کسی قسم کا انس و محبت نہیں تھی اور نہ ہی وہ یہ بات جانتے تھے کہ یہ ہماری اپنی زبان ہے۔ حالانہ ہر ایک قوم اپنی زبان سے پہچانی جاتی ہے اور اپنی زبان سے ہی کوئی قوم قوم ہوتی ہے۔ اپنی زبان کے بغیر کوئی بھی قوم دنیا میں ترقی نہیں کرسکتی اور جو بھی قوم اپنی زبان کو بھلا دیتی ہے وہ قوم صفحۂ ہستی سے کٹ جاتی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ پختون ایک ایسا بے پرواہ اور غافل انسان ہے کہ وہ جہاں بھی چلا جائے اس کی اپنی زبان تو رہ جاتی ہے اور وہ دوسروں کی زبان سیکھ لیتا ہے۔ اس نے کہیں بھی ایسا نہیں کیا کہ دوسروں کو اپنی زبان سکھائی ہو۔ پختونوں کو اپنی زبان کے لکھنے پڑھنے میں دلچسپی نہیں ہے۔ ناخواندہ لوگوں کو تو رہنے دیجیے علم دانوں کو جب میں نے کہا کہ ''پشتون'' اخبار کے خریدار بن جاؤ اور اسے پڑھا کرو۔ کیوں کہ یہ پشتونوں کا اپنا پشتو زبان کا اخبار ہے تو اس کا جواب ان کی طرف سے یہ ہوتا تھا کہ پشتو میں کیا دھرا ہے اور وہ اس میں کیا پڑھے گا اور اس سے کیا سیکھے گا؟

میں انہیں کہتا تھا کہ یہ تو پشتو کا قصور نہیں ہے۔ آج تم دنیا بھر میں جو زبانیں دیکھ رہے ہو یہ زبانیں بھی پہلے ہماری پشتو زبان کی طرح پچھڑی ہوتی تھیں۔ یہ کسی آسمان سے نہیں اتری تھیں۔ لیکن ان میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی زبانوں کی خدمت کی اور انہیں آسمان پر پہنچا دیا۔ اور ہم میں سے کس نے اس زبان کی خدمت اور ترقی کے لیے کوشش کی ہے؟ زبانیں تو جادو کی چھڑی یا چھومنتر سے ترقی نہیں کرتیں۔ یہ تو ہمارے انگریزی کے بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات تھے اور دوسری طرف ہمارے ملا تھے یہ پراپیگنڈہ کرتے تھے کہ پشتو دوزخیوں کی زبان ہے اور یہ دوزخ میں بولی جائے گی۔ اور قوم بے چاری اتنی ناسمجھ اور بے علم تھی کہ اس نے ملا صاحب سے اتنا تو پوچھا ہوتا کہ دوزخ سے کب آئے ہو اور یہ معلومات تمہیں کس طرح حاصل ہوئی ہیں کہ پشتو دوزخی زبان ہے؟

انہی حالات میں "پشتون" اخبار جاری ہوا اور بہت جلد پشتونوں میں ہر دل عزیز ہو گیا اور دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی پشتون رہتے وہ اسے منگواتے تھے۔ امریکہ میں رہنے والے پشتونوں نے تو اس اخبار کی اشاعت کو فروغ دینے کے لیے نمایاں مدد کی اور صرف انہوں نے اس کی اشاعت بڑھانے ہی میں نہیں بلکہ اس کی مالی معاونت بہم پہنچانے میں بھی حصہ لیا۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ امان اللہ خان کے وقت میں افغانستان میں یہ اخبار بہت ہر دل عزیز تھا۔ اور اس نے لوگوں میں پشتو زبان کے ساتھ اتنی محبت و پیار پیدا کر دیا تھا۔ کہ امان اللہ خان اور ان کے ساتھیوں نے بھی پشتو کا ایک اخبار افغانستان سے جاری کیا۔ جس کا نام "پشتون

زغ'' تھا۔ امان اللہ خان کا خود پشتو زبان سے اتنا شوق پیدا ہو گیا تھا کہ بقول کسے اس نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ تین سال کے اندر اندر ہر ایک سرکاری ملازم پشتو سیکھ لے کیوں کہ تین سال کے بعد پشتو سرکاری اور قومی زبان بن جائے گی انگریزوں نے اسے ان کاموں کے کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ کہا جاتا ہے کہ ''پشتون زغ'' کے ابھی صرف نو پر چے ہی نکلے تھے کہ فرنگیوں نے ملانوں' حضرتوں اور بزرگوں وغیرہ کا نام نہاد مذہبی رہنماؤں اور دینی عالموں کے ذریعے افغانستان میں آگ لگا دی اور امان اللہ خان کو کافر قرار دے دیا۔ انہوں نے امان اللہ خان کو افغانستان سے باہر نکلوا کر ہی دم لیا یعنی اسے اٹلی چلے جانا پڑا۔

اب سوچیے پشتونوں کے اس عمل سے کسے نقصان پہنچا؟ خود انہی کو۔ امان اللہ خان تو ان کی بہبود فائدے' ان کی آبادی' شادابی' اور ترقی کا خواہاں تھا مگر یہ لوگ اسی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور دوست و دشمن میں تمیز نہ کر سکے اور جوش میں اپنے ہی سچے بہی خواہ کو ملک سے نکال دیا۔ یہ ان کی بے حد ناشکر گزاری تھی اور احسان فراموشی خدا کے ہاں بڑا بھاری جرم ہے۔ اسی لیے تو ان کے سروں پر خدا نے بچہ سقہ مسلط کر دیا تھا۔ ان کی اور ان کے ملک کی تعمیر و ترقی کو تنزل میں بدل دیا تھا

افغانستان کی بربادی کو ہم لوگ اپنی تباہی تصور کرتے تھے اور انگریزوں نے افغانستان کو ہماری اپنی وجہ سے تباہ کیا۔ کیوں کہ افغانستان کی ترقی کا اثر سیدھا ہم پر پڑتا تھا۔ اور فرنگی یہ نہیں چاہتے تھے۔ ہم سے جتنا بھی ہو سکتا تھا چاہے مالی طور پر یا جانی طور پر ہم نے اس مصیبت میں افغانستان کی امداد کی ہے اور اس وقت تک اپنی

امداد جاری رکھی جب تک کہ نادر خان کامیاب نہ ہو گیا۔

میں افغانستان کے انقلاب کے زمانے میں اس کے حق میں پروپیگنڈہ کرنے اور امداد فراہم کرنے کے لیے ہندوستان گیا تھا۔ پنجاب میں میں نے ڈاکٹر اقبال ظفر علی خان ملک لال خان اور ایسے ہی دوسرے بہت سے مسلمان لیڈروں سے ملاقات کی تھی۔

لاہور میں ڈاکٹر اقبال سے ملنے پر میرے خلافت کے ساتھیوں نے بڑی مذمت کی تھی اور وہ مجھے کہتے تھے کہ میں نے ڈاکٹر اقبال سے کیوں ملاقات کی تھی وہ تو کسی کام کا آدمی نہیں ہے لیکن آج تک میں پنجاب کے اخباروں اور لیڈروں کو دیکھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ وہ اسی اقبال کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے۔ اور یہ بھی کہتے تھے کہ پاکستان کا خیال سب سے پہلے اس کے دل و دماغ میں آیا تھا۔ یہ تخیل اسی نے پیدا کیا تھا۔ پنجاب کے مسلمانوں کا کوئی گناہ نہیں ہے دنیا بھر میں یہ قاعدہ جاری ہے کہ زندہ قومیں زندوں کی قدر کرتی ہیں۔ اور مردہ قومیں مردوں کی قدر کرتی ہیں۔ ہم مسلمان لوگ ہمیشہ مردوں کی قدر کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں زندہ انسانوں کی کوئی قدر نہیں ہے۔

☆☆☆

مولانا محمد علی جوہر سے ملاقات

لاہور سے میں پھر لکھنو چلا گیا۔لکھنو میں کانگریس کا جلسہ تھا۔اوراس میں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ان دونوں سے پہلے میری کوئی جان پہچان نہ تھی لیکن جواہر لال نہرو کے میرے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب سے بڑے مراسم تھے۔کیوں کہ یہ دونوں ایک ہی جگہ انگلینڈ میں رہ چکے تھے۔اورلندن یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھے تھے۔ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک تعارفی خط ان کے نام لکھ دیا تھا۔جب جلسہ ختم ہواتو جواہر لال نہرو جو چودھری خلیق الزمان کے مہمان تھے۔مجھے بھی اپنے ہمراہ اپنے میزبان کے گھر لے گئے۔کھانا کھانے کے بعد میرے اورنہرو کے درمیان افغانستان کے بارے میں بہت باتیں ہوئیں

لکھنو سے میں پھر دہلی چلا آیا۔جمعہ کے روز مسجد میں مولانا محمد علی سے میری ملاقات ہوگئی۔محمد علی اچھے انسان تھے اور میرے بڑے مہربان تھے لیکن ان کے بڑے بھائی شوکت علی کوئی اچھے آدمی نہیں تھے مگر ان کا محمد علی پر بڑا اثر تھا۔لہذا وہ کبھی کبھار محمد علی کو غلط راستے پر چلا دیا کرتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ محمد علی سے میں ناراض تھا اوران سے میں نے قدرے پہلو بچایا مگر انہوں نے مجھے دیکھ ہی لیا۔وہ خود میرے پاس چلے آئے اور مسکرا دیے اورہنسی خوشی میں مجھ سے یہ کہہ دیا ''ہم پٹھانوں کی کچھ پرواہ نہیں کرتے''۔

پھر کیا تھا تھوڑی نوک جھونک ہوگئی۔میں نے ترکی بترکی جواب دیا ''ہم بھی

ایسے لیڈروں کی پرواہ نہیں کرتے جو لوگوں کے ورغلانے سے غلط راستے پر چلتے ہیں ‘‘۔

لگے ہاتھوں میں نے یہ بھی کہہ دیا ’’مولانا صاحب آپ ذرا فکر کریں آپ جو باتیں امان اللہ خان کے بارے میں کہتے ہیں وہی تو انگریز بھی کہتے ہیں‘‘۔

اس بات کا ان پر گویا بہت اثر ہوا۔ انہوں نے مجھے فوراً گلے لگالیا اور کہا ’’بھائی مجھے حقیقت سے آگاہ کردو‘‘۔

اس کے بعد محمد علی صاحب مجھے اپنے گھر میں لے گئے۔ حقیقت یہ تھی کہ امان اللہ خان جس وقت یورپ جا رہے تھے اس وقت شوکت علی صاحب نے بڑی دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا تھا اور انہیں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا تھا اس سپاسنامے میں شوکت علی صاحب نے امان اللہ خان کی تعریفوں کے پل باندھ دیے تھے میں بھی اس تقریب میں موجود تھا لیکن وداع کے بعد میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ شوکت علی کو جس قدر توقع تھی امان اللہ خان نے اتنے پیسے انہیں نہیں دیے اس لیے وہ امان اللہ خان سے ناراض تھے۔

☆☆☆

خدائی خدمت گار تحریک کا آغاز

کچھ دنوں کے بعد نادر خان کی طرف سے کابل کی فتح کا تار موصول ہوا تو ہم نے بڑی خوشی منائی۔ اس خوشی میں ہم لوگوں نے ایک جلوس ہشت نگر کے شمالی سرے اور دوسرا جلوس ہشت نگر کے نچلے سرے سے نکالا۔ یہ دونوں جلوس اتمان زئی میں ایک جگہ اکٹھے ہو گئے اور اس جگہ ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا جلسہ میں بے شمار قومی نظمیں پڑھی گئیں اور تقریریں بھی ہوئیں اور میں نے بھی اس موقع پر ایک تقریر کی۔

میں نے اپنی تقریر میں پٹھانوں سے کہا کہ "دنیا میں دو ہی راستے ہیں جن پر چل کر قومیں ترقی کر سکتی ہیں۔ ایک مذہب اور دوسرا قومیت۔ آج اگر تمہیں علم حاصل نہ ہو تو آنکھیں تو موجود ہیں۔ یورپ اور امریکہ کو دیکھو جن میں مذہب تو نہیں ہے لیکن ان کے اندر قومیت موجود ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ آسمان تک جا پہنچے ہیں اور ہم ہیں کہ زمین پر بھی نہیں چل سکتے۔ وہ آباد ہو گئے ہیں اور ہم برباد ہیں۔ ان کی زندگی کو دیکھو۔ اور اپنی زندگی کو بھی دیکھو۔ ہماری اس تباہی و بربادی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم میں نہ مذہب ہے اور نہ قومیت۔ دنیا میں ایک عظیم انقلاب آ رہا ہے اور تم لوگوں کو اس کی خبر تک نہیں۔ میں حال میں ہندوستان گیا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہندوستان کی عورتوں اور مردوں دونوں نے اپنی قوم کی خدمت کے لیے کمر کس رکھی ہے اور تمہاری عورتوں کی بات تو الگ رہی یہاں مرد بھی خدمت کے لیے تیار نہیں ہیں اور تیاری کی تو کیا بات وہ قوم اور ملک سے ناآشنا ہیں۔ انقلاب ایک سیلاب

ہوتا ہے۔اس میں فائدہ بھی ہوتا ہے۔اور نقصان بھی۔اس سے قومیں آباد بھی ہوتی ہیں اور برباد بھی۔اس سے کون سی قومیں فائدہ اٹھاسکتی ہیں جو جاگ رہی ہوتی ہیں جن قوموں میں پریم محبت اور اتفاق ہوتا ہے۔ انقلاب ایک سیلاب ہوتا ہے جو قومیں بیدار ہوتی ہیں وہ سیلاب کے انتظار میں کھڑی رہتی ہیں اور جونہی سیلاب آتا ہے وہ سیلاب کے ساتھ ہو جاتی ہیں اور اسے اپنی زمینوں کی طرف موڑ دیتی ہیں۔اس سے استفادہ کر لیتی ہیں اور جو قومیں خوابیدہ ہوتی ہیں جن میں بھائی چارہ باہمی ملاپ اور قوم پروری کا فقدان ہوتا ہے۔اور جو خودغرض ہوتی ہیں ان پر جب یہ سیلاب آتا ہے تو وہ قومیں بہہ جاتی ہیں۔سیلاب انہی قوموں کو بھی بہالے جایا کرتا ہے اور ان کی زمینوں کو بھی''۔

اس کے بعد میں نے حاضرین سے پھر کہا ''اے پٹھانو تم ان ترقی یافتہ قوموں کو دیکھو تمہارا یہ خیال ہوگا کہ یہ قومیں شاید اسی حالت میں آسمان سے اتری تھیں' لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ یہ بھی ہماری طرح قومیں ہیں۔تو پھر انہوں نے کیوں کر ایسی ترقی کر لی اور ہم کیوں بچھڑ گئے؟ یہ بات قابل غور ہے۔ان کی ترقی کا یہ راز ہے کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنا ذاتی عیش' اپنا آرام' اپنی ترقی اور اپنی آبادی قوم کی آبادی پر قربان کر دی اس سے ان کی قوم خوش حال اور بلند مرتبت ہو گئی لیکن ہم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوئے اس لیے ہم پیچھے رہ گئے۔ دوسرے لوگ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اگر ان کی قوم ترقی کرلے گی تو وہ بھی ترقی کر لیں گے۔

لیکن ہم لوگوں کو اپنی اپنی ہی فکر لگی ہوئی ہے۔ہم میں ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ

قوم کو چاہے دریا برد کردے گا کسی طرح خود آباد ہو جائے۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھتا کہ اگر وہ آباد ہو گیا تو ایک صرف وہی آباد ہوا اس سے قوم آباد نہیں ہوئی اور اگر قوم آباد ہو جاتی ہے تو ہم سب آباد ہو جاتے ہیں۔ دوسری قوموں کی زندگی اجتماعی زندگی ہے۔ جانور بھی اپنے لیے گھونسلہ بناتا ہے اور مادہ بھی رکھتا ہے۔ بچے بھی پیدا کرتا ہے۔ بچوں کو پالتا اور بڑا کرتا ہے۔ اور ہم بھی یہی کام کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم میں اور حیوان میں کیا فرق ہے؟ ہم اشرف المخلوقات کیسے بن بیٹھے ہیں؟ اسی لیے اس بات پر زور دیتا ہوں کہ اگر تم پہلے ملک اور قوم کی ترقی اور خوشحالی چاہتے ہو تو اس انفرادی زندگی کی بجائے قوم کے اندر اجتماعی زندگی پیدا کرو...... اس کے بغیر قومیں ترقی نہیں کرسکتیں۔

تقریر کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا "میں نے سنا ہے کہ امان اللہ خان ہا کرتا تھا کہ "میں پشتونوں کا انقلابی بادشاہ ہوں" یہ حقیقت ہے کہ ہم پشتونوں میں تو انقلاب اسی نے پیدا کیا ہے اور افغانستان کے انقلاب سے جتنا فائدہ پشتونوں نے اٹھایا ہے اتنا استفادہ خود افغانستان کے لوگوں نے نہیں کیا کیوں کہ وہ سو رہے تھے اور ہم تھوڑے جاگ چکے تھے"۔

اس جلسہ کا لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑا ہے اور دوسرے دن چند نوجوان میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے کہا کہ وہ قوم کی خدمت اور اصلاح کے لیے ایک جماعت بنانا چاہتے تھے اور اسی طرح ہمارے درمیان صلاح و مشورے شروع ہو گئے۔ ہماری ایک جماعت پہلے ہی موجود تھی "اصلاح الافاغنہ"...... یہ جماعت

ہمارے صوبے میں تعلیم پھیلانے کا کام کر رہی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ جماعت تو یہی کام کرتی رہے کیوں کہ یہ کام بڑا ضروری تھا لیکن ہماری قوم میں اور بہت سی سوشل کمزوریاں اور عیب ہیں۔ اور سماجی طور پر ہم بہت پس ماندہ ہیں۔ ان کمیوں کو دور کرنے کے لیے ہمیں ایک الگ سوشل تحریک جاری کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم نے ''خدائی خدمت گاری'' جو ایک سوشل تحریک تھی بنیاد رکھ دی تھی اس تحریک کا سیاست سے کچھ بھی تعلق نہیں تھا۔ لیکن فرنگیوں کے ظلم و تشدد نے اس کا تعلق سیاست سے بھی پیدا کر دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کانگریس سے خود انگریزوں نے یکجا کیا ہے۔

ہم پٹھانوں میں پارٹی بازیاں' باہمی دشمنیاں' بغض عناد بری رسمیں اور برے رواجات موجود ہیں۔ ہمارے درمیان جھگڑے اور فسادات بھی چلتے تھے۔ اور جو کچھ ہم پیدا کرتے تھے وہ سب کچھ تو ہم برے رسم و رواج' جھگڑے و فسادات اور مقدمہ بازی کی نذر کر دیتے تھے اور خود اسی طرح بھوکے پیاسے ننگے اور بدحال رہ جاتے تھے۔ ہم نہ تو تجارت کا کام کرتے تھے اور نہ ہی زراعت کا اور نہ ہی ان کاموں کے لیے ہمیں فرصت تھی۔ بڑے سوچ بچار اور صلاح و مشورے کے بعد ۱۹۲۹ء میں ہم نے یہ جماعت بنائی۔ ''خدائی خدمت گاری'' کا نام دے دیا۔ یہ نام بھی اسی جماعت کا ہم نے ایک خاص غرض سے رکھا تھا۔ یونکہ پٹھانوں میں ہم لوگ خدا کے واسطے اپنی قوم و ملک کی خدمت کا خیال اور جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ کہ اس لیے پٹھانوں میں خدا کے لیے اپنی قوم و ملک کی خدمت کا جذبہ مفقود تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ پٹھانوں کے اندر تشدد بھرا ہوا تھا اور ان کا یہ تشدد غیروں کے

لیے نہیں تھا بلکہ ان کا ساری تشدد اپنی قوم اور اپنے بھائی بندوں کے خلاف ہی تھا۔ جو بھی آدمی ان کا بہت قریبی رشتہ دار ہوتا تھا وہ ان کے تشدد کے ہاتھوں میں ہمیشہ آگ میں کھڑا رہتا تھا اور ان کے تشدد کی ساری آگ اپنے بھائی اور عزیز ہی کے اوپر برستی تھی۔ اس کے علاوہ پٹھانوں میں ایسی پارٹی بازی اور پھوٹ تھی کہ ان سے ان کا گھر برباد تھا۔ اس کے علاوہ رجعت پسندانہ رسم و رواج ان کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ ان میں انتقام کا جذبہ بھی غیر معمولی تھا اور ان میں اچھے اخلاق اور اچھی عادات کا بھی فقدان تھا۔

ان حالات کے پیش نظر جماعت ''خدائی خدمتگاری'' کا ممبر بننے کے لیے ممبر کو یہ قسم لینا اور یہ وعدہ کرنا پڑتا تھا ''میں خدائی خدمت گار ہوں اور چونکہ خدا کو خدمت کی ضرورت نہیں ہے لہذا خدا کی مخلوق کی خدمت ہی خدا کی خدمت ہے۔ لہذا میں خلق خدا کی خدمت بغیر کسی غرض اور مطلب صرف خدا کے واسطے کروں گا''۔

خدائی خدمتگار کو دوسرا وعدہ یہ کرنا پڑتا تھا ''میں تشدد نہیں کروں گا اور نہ ہی کسی سے انتقام یا بدلہ لوں گا۔ مجھ پر کوئی چاہے کتنا ہی ظلم اور زیادتی کرے گا میں اسے معاف کر دوں گا'' خدائی خدمت گار بھی یہ حلف اٹھاتا ہے ''میں باہمی پھوٹ' گروہ بندی اور دشمنی و خانہ جنگی سے دور رہوں گا۔ اور ہر ایک پختون کو اپنا بھائی اور دوست سمجھوں گا...... میں رسم و رواج چھوڑ دوں گا۔ سادہ زندگی بسر کروں گا اور نیک کام کروں گا اور برائیوں سے جان بچاؤں گا۔ اور یہ کہ میں اپنے اندر اخلاق اور اچھی عادات پیدا کروں گا۔ میں بیکاری کی زندگی نہیں بسر کروں گا''۔

علاوہ ازیں ایک خدائی خدمت گار پر یہ پابندی تھی کہ چاہے وہ امیر ایا غریب ہے، دن میں دو گھنٹے جسمانی مشقت سب کو کرنا پڑے گی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں خلافت کانفرنس ہوئی۔ صوبہ سرحد سے ہم لوگ بھی اس میں شمولیت کے لیے گئے۔ کلکتہ میں پشاور کے اور بھی بہت سے لوگ رہتے تھے جو میوہ جات کی تجارت کرتے تھے۔ جب خلافت کانفرنس شروع ہوئی تو ہمارے نوٹس میں یہ بات آئی کہ پنجابیوں کے محمد علی وشوکت علی سے بڑے سخت اختلافات ہیں۔

پنجابی ایک عجیب وغریب مخلوق ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمایئے ''ایک دن ''زمیندار'' کے دفتر میں اختر علی خان سے یہ شکایت کر رہا تھا کہ دیکھو میرے اور تمہارے والد کے مابین کتنے اچھے تعلقات ہیں۔ اگر پنجاب کے دوسرے اخبارات میرے خلاف غلط پروپیگنڈہ کرتے ہیں تو کم از کم تمہیں تو نہیں کرنا چاہیے کہ میرے متعلق پنجاب میں غلط فہمیاں پھیلاؤ''

میری یہ شکایت سن کر اختر علی خان ہنس پڑے اور بولے ''ہماری یہ فطرت ہے کہ نہ تو ہم پنجاب کے کسی لیڈر کو بخشتے ہیں نہ ہی ہندوستان کے کسی رہنما کو نظر انداز کرتے ہیں بلکہ عادتاً سب کی پگڑی اچھالتے رہتے ہیں''۔

یہی تماشہ کلکتہ میں بھی پنجابیوں نے سبجیکٹس کمیٹی کے اجلاس میں کیا۔ ایک رات خلافت کی سبجیکٹس کمیٹی کی میٹنگ تھی اور ہم سب سٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک پنجابی لیڈر تقریر کر رہے تھے اور اپنی تقریر میں وہ محمد علی صاحب پر نکتہ چینی کر رہے تھے اور حملے کر رہے تھے۔

محمد علی صاحب میرے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے وہ صبر نہیں کر سکے اور غصے میں آ گئے اور ان کے منہ سے اس پنجابی لیڈر کے خلاف ناشائستہ کلمات نکل پڑے۔ ہمارے پاس ہی ایک طرف ایک اور پنجابی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اسنے محمد علی کے منہ سے جونہی یہ گالی گلوچ سنی تو وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا چاقو نکال لیا اور جواب میں محمد علی کو گالی گلوچ دینا شروع کر دیا۔ اسٹیج پر ایک زبردست ہنگامہ بپا ہو گیا۔ یہ اچھا ہوا کہ ہم پٹھان لوگ اس رات کے سبجیکٹس کمیٹی کے جلسے میں بہت زیادہ تعداد میں شریک تھے۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ جھگڑا ختم کرا دیا اور محمد علی صاحب کو ان سے مخلسی دلا دی۔ اگر ہم نہ ہوتے تو انہوں نے محمد علی کو سخت بے عزت کیا ہوتا۔

ان دنوں کلکتہ میں کانگیس کا جلسہ بھی جاری تھا اور حالات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محمد علی ہندوؤں سے ناراض ہیں' کیونکہ انہوں نے اپنے خلافت کے صدارتی خطبے میں ہندوؤں پر بڑے سخت حملے کیے تھے۔ اور ان کے تمدن معاشرت اور رسم و رواج پر بڑے اوچھے طریقے سے نکتہ چینی کی تھی۔ یہ چیزیں ایک لیڈر کے شایان شان نہیں تھیں اور ہماری کانفرنس میں کوئی خاص لطف نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو جا کر کانگریس کا وہ جلسہ دیکھ آئیں اس وقت کانگریس کی سبجیکٹس کمیٹی کا اجلاس تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لیے چلا گیا۔

میں کانگریس کے جلسوں میں پہلے کبھی نہیں شامل ہوا تھا۔ اس وقت گاندھی جی تقریر کر رہے تھے۔ وہاں ایک نوجوان لڑکا تھا جسے لوگ راجہ کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ ان کی تقریر کے بیچ میں بار بار کھڑا ہو جاتا اور گاندھی جی پر حملے کرتا۔ گاندھی جی بالکل

غصے میں نہیں آتے تھے بلکہ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے اور اپنی تقریر پھر شروع کر دیتے۔ وہ نوجوان پھر مداخلت کرتا۔ گاندھی جی پھر ہنس دیتے۔ اس کا مجھ پر بے حد اثر ہوا۔ اور میں جب واپس اپنے کیمپ میں آیا تو میں نے یہ سرگزشت اپنے ان ساتھیوں کو سنائی اور میں نے انہیں کہا کہ دیکھ لو یہ ہندوؤں کو لیڈر ہے۔ اس کے اخلاق کو دیکھو اور اپنی کانفرنس کے ان لیڈروں کے اخلاق کو دیکھو۔

ہمارے دل میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوا۔ اس جذبے کے زیر اثر ہم کچھ پٹھان اصحاب محمد علی صاحب کے پاس گئے۔ ہم اس بارے میں ان سے چند باتیں کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ ہمارے لیڈر تھے۔ ہم نے محمد علی صاحب کے ساتھ اپنی بات چیت اس طرح شروع کی۔

''محمد علی صاحب آپ ہم مسلمانوں کے لیڈر ہیں۔ ہم آپ کی توقیر اور عزت چاہتے ہیں۔ ہم کل کانگریس کی سبجیکٹس کمیٹی کے اجلاس میں گئے تھے۔ اس وقت گاندھی جی تقریر کر رہے تھے۔ ان کی تقریر کے درمیان ہی ایک نوجوان ان کی مخالفت اور ان پر نکتہ چینی کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ ان ہیں ناشائستہ الفاظ سے مخاطب کرتے تھے۔ لیکن گاندھی جی ان کے سامنے ہنس دیتے تھے اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس مداخلت اور نکتہ چینی کی وجہ سے شاید ہی ان کی تقریر میں کسی قسم کی تیزی یا تندی پیدا ہوئی ہو۔ یہ بات ہم آپ کو اس لیے بتا رہے ہیں کہ آپ ہمارے رہنما ہیں۔ ہم آپ کی برتری کے خواہاں ہیں' اس لیے اگر آپ اپنے اندر صبر کا مادہ پیدا کر لیں تو یہ بہت اچھا ہوگا''۔

محمد علی صاحب ہماری یہ باتیں سنتے ہی بہت ناراض اور غضب آلود ہو گئے اور بول اٹھے ""دیکھو جنگلی پٹھان محمد علی کو سمجھانے آئے ہیں"

یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں وہیں چھوڑ کر خود کہیں اور چلے گئے۔ ہم ان کے اس رویے سے بڑے مایوس اور دل میں ناراض ہوئے۔ اس دن سے پھر کبھی خلافت کے ان جلسوں میں شریک نہیں ہوا اور واپس چلا آیا۔

اس کے بعد دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں ہمارے صوبے کے بھی بہت سے لوگ شریک ہوئے۔ میں بھی شریک ہوا۔ اجلاس میں یہ بات دیکھ کر ہم پٹھان لوگوں پر زبردست اثر ہوا کہ وہاں مردوں کی بات تو رہنے دیجیے لڑکیوں نے بھی ملک وملت کی خدمت کرنے کے لیے کمر کس رکھی تھی۔ پشتون عورتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ یہاں جب عورتوں کو اس قدر مستعد اور سرگرم دیکھا تو ہم پر اس بات کا اثر ہونا قدرتی امر تھا۔ ہم صوبہ سرحد سے جتنے لوگ بھی وہاں گئے تھے ایک جگہ اکٹھے ہو گئے اور اپنے لوگوں کے مابین ہم نے بھی جلسہ کیا اور ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں بھی اپنی قوم اور ملک کی خدمت کرنا چاہیے۔ یہ جذبہ کانگریس کی یہ کانفرنس دیکھ کر ہی ہمارے اندر پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں ہمارے نزدیک یہ امر بھی کافی اہمیت رکھتا ہے کہ کانگریس کے اجلاس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی قرارداد بھی منظور ہوئی تھی۔

ہم لوگ جب لاہور سے واپس اپنے گاؤں میں پہنچے تو ہم نے کام شروع کر دیا۔ ہم لوگ گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔ تقریریں کرتے تھے جرگے بناتے تھے۔

خدمت خلق کے لیے ''خدائی خدمت گار'' بھرتی کرتے تھے۔ ہماری یہ تحریک بہت جلد سارے صوبے میں پھیل گئی۔ ہمارے قبائل میں بھی جا پہنچی اور اتنی ہر دل عزیز ہوئی کہ جس گاؤں میں بھی ہم جاتے تھے وہاں جرگہ اور خدائی خدمت گار جماعتیں قائم ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہماری اس تحریک نے سب سے بڑی بات یہ پیدا کر دی کہ لوگوں کے دلوں میں انگریز حکومت کا خوف اور دہشت کا نقش مٹ گیا اور ان کے اندر حریت کا ایک زبردست جذبہ موجزن ہو گیا۔ جب ہم دورے پر نکلتے تھے تو پولیس اور سی آئی ڈی کے علاوہ بھی کبھی کبھی خود فرنگی بھی ہمارے ان جلسوں کو دیکھنے آیا کرتے تھے اور وہ بھی حیران ہوتے تھے کہ یہ اتنا عظیم انقلاب کس چیز نے پیدا کر دیا ہے۔ وہ لوگ مجھ سے بھی کبھی کبھار پوچھا کرتے تھے کہ یہ تم نے پٹھانوں پر کیا جادو کر دیا ہے؟ دراصل انہیں ایک خطرہ لاحق ہو گیا تھا چند مہینوں تک تو انگریزوں نے بڑے صبر و تحمل سے ہمارے کام کو دیکھا بھالا۔ اور ہمیں لمبی مہلت دے دی۔ ادھر ان چار مہینوں میں ہم نے بھی دن رات اتنا کام کیا کہ ہماری یہ تحری سارے صوبے میں پھیل گئی۔ ابھی قریباً تین مارہ کام کرتے ہوئے ہم نے گزارے تھے کہ چیف کمشنر صاحب نے میرے نام حکم بھیج دیا۔ ''یہ تم نے کیا سلسلہ جاری کر رکھا ہے؟ اسے فوراً بند کر دو''۔

میں نے اس حکم کے جواب میں چیف کمشنر صاحب کو یہ لکھا کہ ''یہ تو ایک سوشل تحریک ہے' سیاسی نہیں ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہم کام جو کر رہے ہیں ملک سرکار کو کرنا چاہیے۔ یہ کام تو حکومت کے کرنے کا ہے۔ آپ کے کرنے کا ہے۔ اب اگر

آپ کا یہ کام حکومت کا یہ کام ہم کر رہے ہیں تو آپ کو اس کام میں میری مدد اور تعاون کرنا چاہیے“۔

چیف کمشنر نے مجھے کہا ”میں مانتا ہوں کہ آج یہ کام سوشل ہے اور اگر تم ان پٹھانوں کو کبھی منظم کر لو تو پھر اس بات کی کیا دلیل یا ضمانت ہے کہ تم انہیں ہمارے خلاف استعمال نہیں کرو گے“۔

میں نے ان سے کہا کہ قوموں کی ضمانت اعتماد پر ہوتی ہے۔ آپ ہم پر اعتماد کیجیے تو ہم آپ پر اعتماد کریں گے۔ ہم آپ کے خلاف کچھ بھی نہیں کرتے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس ملک میں ایک انقلاب آ رہا ہے اور انقلاب تو ایک سیلاب ہوا تا ہے۔۔ ہم صرف اتنا کرتے ہیں کہ پٹھانوں کو منظم کرتے ہیں۔ مبادا وہ اس انقلاب میں ہم سے بہہ جائیں“۔

☆☆☆

گجرات جیل......زندگی کے شاندار لمحات

ہماری اس بات کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔لیکن انگریزوں نے ہم پر اعتماد نہ کیا۔اور جب اپریل ۱۹۳۰ء میں اتمان زئی میں ہم خدائی خدمت گاروں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہو چکا اور میں اس جلسے کے بعد پشاور جا رہا تھا تو راستے میں نا کی تھانے کے پاس مجھے گرفتار کر لیا گیا اور واپس چارسدہ لایا گیا۔میرے ساتھ میاں احمد شاہ جو ہمارے صدر تھے اور عبدالاکبر خان جو سکریٹری تھے اور سالار سرفراز خان و حاجی شاہنواز خان جو ہمارے جلسے کے منتظم تھے وہ سب بھی گرفتار کر لیے گئے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب مجھے نا کی تھانے کی حدود میں گرفتار کیا گیا تو اس وقت میرے ساتھ کوئی خدائی خدمت گار رضا کر نہیں تھا۔ نا کی تھانے کے لوگوں نے جب میری گرفتاری دیکھی تو انہیں بڑا غصہ آیا اور وہ کہنے لگے کہ انگریزوں نے ہماری بے حرمتی کی ہے کہ بادشاہ خان کو ہماری حدود کے اندر گرفتار کیا ہے۔لہٰذا اپنے اس قہر اور غصے کا جواب نا کی تھانے کے لوگوں نے ایک ایسے شائستہ طریقے سے دیا کہ اس سے میں بہت خوش ہوا۔اور وہ یہ کہ انوں نے خدائی خدمت گاری کا اعلان کر دیا۔خود بھی سرخ پوش بن گئے اور مجھے بھی انگریزوں کے سامنے جن سے میری جنگ تھی سرخرو کر دیا۔

میری گرفتاری کی خبر تیزی سے عوام میں پھیل گئی۔چارسدہ میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنے قہر اور غصے کا اظہار کرنے کے لیے جمع ہوئے۔اسی طرح اس

دن پشاور میں بھی ہمارے ساتھی گرفتار کیے گئے تھے۔اور ہماری ان گرفتاریوں کی وجہ سے قصہ خوانی بازار پشاور میں ایک بہت بڑا ہنگامہ ہوااور گولیاں برائی گئیں جس میں بڑی بھاری تعداد میں لوگ شہید ہو گئے اور ۲۳ اپریل کا دن جس دن یہ واقعہ ہوا تھا۔ایک عظیم تاریخی اہمیت سے وابستہ ہو گیا۔

چارسدہ میں بھی لوگوں نے حوالات کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا لیکن چونکہ ہم نے لوگوں کو عدم تشدد کا درس دیا تھا اور ڈاکٹر خان صاحب بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھا دیا اس لیے وہاں کسی قسم کا تشدد نہ ہوا۔شام کے وقت ہمیں موٹر میں بٹھایا گیا مردان سے ایک فوجی رسالا آیا تھا رسالے کا کچھ حصہ ہماری موٹر کے آگے اور کچھ پیچھے تھا۔ اس طرح ہمیں مردان پہنچا دیا گیا۔ اسی شام کو ہمیں مردان کے جیل خانے میں بند کر دیا گیا رات ہم نے جیل خانے میں گزردی اور دوسرے دن ہمیں رسال پور لے جایا گیا۔ یہاں ہمارے علاقے کا مجسٹریٹ خان بہادر قلی خان آیا ہوا تھا۔ہمیں اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس نے ہمیں دفعہ چالیس کے تحت تین تین سال کی قید کی سزا دے دی۔اور اس جگہ سے ہم پنجاب کے گجرات جیل میں بھیج دیے گئے۔ جب ہم جیل خانے پہنچے تو وہاں پشاور کے ہمارے دوسرے ساتھیوں علی گل خاں سید لال بادشاہ وغیرہ دوسرے اصحاب کو بھی لایا جا چکا تھا۔اس جیل خانے میں پنجاب' دہلی اور صوبہ سرحد کے لیڈر سیاسی قیدی تھے۔ان میں چاہے سکھ اور ہندو تھے یا مسلمان تھے سبھی اصحاب نہایت معقول اور سنجیدہ مزاج تھے۔ اس جیل خانے میں میں نے جس قدر مذہبی علمی اور سیاسی

فائدے حاصل کیے اور جو اعلیٰ اور مست اور شاندار زندگی گزاردی ویسی زندگی مجھے دوسرے کسی جیل خانے میں پھر کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ یہاں عالموں کی جو شائستہ سوسائٹی مجھے ملی تھی ویسی سوسائٹی پھر بھی مجھے کہیں نہیں ملی۔ وہاں کی بہت سی باتیں میرے ذہن پر اتنے گہرے نقوش چھوڑ آئیں کہ تا زیست نہیں مٹیں گے۔

ڈاکٹر انصاری صاحب نے ہمارے لیے قید خانے میں پارلیمنٹ قائم کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ خدا ہمیں بہت جلد حکومت دینے والا ہے اس لیے مناسب ہے کہ ہم اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔ وہ ہمیں پارلیمنٹ سے متعلقہ کاموں کی تربیت دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند ہمیں مختلف قسم کی کتابیں منگوا دیا کرتے تھے اور روہتک کے لالہ شام لال وہ کتابیں ہمیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ایک رائے زادہ ہنس راج تھے۔ جب کبھی ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی تو ان کی اہلیہ صاحبہ ہمارے لیے قسم قسم کی چیزیں کھانے کو لایا کرتی تھیں۔ میں نے اور پنڈت جگت رام ہریانوی نے قرآن اور گیتا کے درس جاری کر دیے تھے اور ہماری یہ کوشش ہوا کرتی تھی کہ ہندو قرآن سے آگاہ ہو جائیں اور مسلمان گیتا سے۔ ظفر علی خان اور ڈاکٹر کچلو کے درمیان صدارت کے لیے جنگ ہوتی تھی۔ اور دونوں ہمیشہ سرحدیوں کی خوشامدیں کرتے تھے کیونکہ ہم جس کسی فریق کا ساتھ دے دیتے اسی فریق کا آدمی صدر منتخب ہو جاتا تھا۔ ایک اور صاحب سیٹھی جی تھے جو اکثر پکوڑے تل کر گرم گرم ہم میں تقسیم کرتے تھے۔ دیوداس گاندھی بھی چند ایک مہینوں کے لیے اسی جیل خانے میں آیا تھا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب ماش کی دال پکایا کرتے تھے۔ وہ بڑی لذیذ ہوا

کرتی تھی۔مگر اُمیں مرچیں بہت زیادہ ہوتی تھیں۔

ایک دن ہمارے ساتھ جیل خانے میں جو سکھ بھائی تھے انہوں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے کہا ''گجرات شہر میں جھٹکا نہیں ہوتا ہے مگر ہم جھٹکا کھاتے ہیں اس لیے اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم یہاں اپنے کھانے کے لیے ایک مرغی جھٹکا کر لیں گے آپ کی مہربانی ہوگی''۔

سپرنٹنڈنٹ سے یہ جواب پا کر سکھوں کے ایک رہنما میرے پاس آئے اور کہنے لگے ''سپرنٹنڈنٹ کہتا ہے کہ جھٹکے پر آپ لوگوں کو اعتراض ہے اور آپ اس بات کے مخالف ہیں''

میں نے سردار صاحب سے پوچھا ''سردار صاحب! یہ جھٹکہ آپ لوگ کریں گے اور آپ ہی کھائیں گے''۔

سردار صاحب نے جواب دیا ''ہاں ہم ہی کریں گے اور ہم ہی کھائیں گے''۔

تب میں ان سے کہا کہ ''اس پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہماری طرف سے آپ کو اجازت ہے'' کے بعد میں نے اپنے وہ ساتھی اکٹھے کیے۔ ان میں سے سید لال بادشاہ جھٹکے کے مخالف تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ ''سید بھائی! اگر کوئی شخص حلال کی مخالفت کرے تو آپ یہ باتیں کیسی محسوس کریں گے''؟

سید صاحب نے جواب دیا ''یہ تو ہمارا مذہب ہے۔ مذہب کی کوئی کیوں مخالفت کرے گا''۔

میں نے ان ہیں کہا ''جھٹکا ان کے مذہب میں ہے ہمارے لیے یہ بھی مناسب

نہیں ہے کہ ہم اس کی مخالفت کریں''۔

میری اس دلیل سے سید صاحب قائل ہو گئے اور انہوں نے اپنی مخالفت واپس لے لی۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ولی خان سنگین وار سے بچ گیا

ادھر ہمیں گجرات جیل میں بند کر دیا گیا' ادھر ہمارے ملک میں لوگوں پر حکومت نے بڑا سخت قسم کا ظلم اور تشدد شروع کر دیا۔ ہمارے صوبے کا ایسے محاصرہ کر لیا گیا کہ صوبے کے لوگ باہر نہ جا سکیں اور وہاں کے عوام اپنی گریہ و زاری فریاد یا پروپیگنڈہ نہ کر سکیں۔ اور دنیا کے لوگوں کو انگریزوں کے ان مظالم میں اپنی گریہ و زاری فریاد یا پروپیگنڈہ سے آگاہ نہ کر سکیں۔ جو پٹھانوں پر بے تحاشہ توڑے جا رہے تھے۔ علاوہ ازیں باہر کے لوگوں کو بھی ہمارے صوبے میں آنے نہیں دیا جاتا تھا تا کہ وہ ہمارا حال نہ دیکھ لیں۔ ملک کے اندر لوگوں پر آگ کے شعلے بھڑکا رکھے تھے۔

ان حالات میں بھی ہمارے ایک دو ساتھی میاں جعفر شاہ اور میاں عبداللہ شاہ بڑے سخت عذاب سے گزر رہے تھے اور دریائے سندھ کو عبور کر کے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ میری ملاقات تو بند تھی۔ یعنی مجھے کسی سے ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن انہوں نے دوسرے ساتھیوں سے ملاقات کی اجازت حاصل کر لی اور انہیں صوبہ سرحد کے حالات سے آگاہ کر دیا۔ ہمارے ان ملاقاتیوں نے بتایا کہ تحریک کو چھوڑیے انگریز تو پٹھانوں کے بچے بچے کو کچل دینا چاہتے ہیں اور ان کے وجود کو مٹا دینے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں جس وقت ہم لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور اپنے صوبے سے باہر پنجاب میں لا کر گجرات کے جیل میں بند کر دیا گیا تھا اس وقت وہاں فوج پہنچ گئی تھی۔ اور اس نے اتمان زئی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا سب سے

پہلے فوجی جوان خدائی خدمت گاروں کے دفتر پر چڑھ گئے تھے اور دوسری منزل کے جہاں ہمارا دفتر ہے تمام خدائی خدمت گاروں کو نیچے پکی سڑک پر پھینک دیا تھا۔ میرا لڑکا ولی اس وقت چودہ پندرہ سال کا تھا۔ اسکول سے چھٹی ملنے پر دفتر میں آ گیا تھا اور دفتر میں وہ خدائی خدمت گاروں کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک گورے نے اسے سنگین مارنی چاہی لیکن ایک صوبیدار نے سنگین کے آگے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور اسے بچا لیا۔ اسی صوبے دار نے ولی کو ہاتھ سے پکڑ کر اور آہستہ سے نیچے اتار دیا۔ فوجیوں نے خدائی خدمت گاروں کے دفتر میں آگ لگا دی اور اسے جلا کر خاکستر کر دیا۔ پھر گاؤں کا رخ کیا اور سرخ کپڑے والے جتنے لوگ تھے وہ سب گرفتار کر لیے گئے اور انہیں بڑی بے دردی سے زدوکوب کیا گیا۔

اس کے بعد ڈپٹی کمشنر لوگوں سے مخاطب ہوا اور بڑے قہر آلود اور غرور میں اس نے کہا۔ ''کیا اب بھی کوئی سرخ پوش باقی ہے؟'' ڈر کے مارے کسی شخص کو زبان کھولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اتنے میں ہمارے گاؤں کے ایک خان محمد عباس جو وہاں کھڑے تھے ڈپٹی کمشنر کی یہ بات سن کر دوڑ کر گھر گئے لال رنگ دیگ میں ڈالا اور یہ سرخ کپڑے انہوں نے پہن لیے کپڑوں سے ابھی تک پانی بہہ رہا تھا کہ دوڑ کر پھر اسی جگہ آ گئے اور فوجیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور انگریز ڈپٹی کمشنر سے کہا ''یہ ہیں سرخ کپڑے دیکھو میں نے پہن رکھے ہیں''۔

محمد عباس خان با قاعدہ خدائی خدمت گار بھی نہیں تھے اور ہم سے تھوڑا بہت ناراض بھی تھے۔ پھر بھی انہوں نے خودداری اور وطن پرستی کا ثبوت دیا فوج نے

انہیں بھی گرفتار کرلیا لیکن ان کی اس جرات اور قربانی نے پٹھانوں کے اندر وہ دلیری پیدا کر دی کہ انگریزوں کے بے انتہا ظلم اور تشدد کے باوجود سرخ کپڑے ختم نہ ہوئے بلکہ دن بدن ان میں اضافہ ہونے لگا۔

اتمان زئی کے تاریخی جلسے کے دن صوبہ میں سرخ پوشوں یعنی خدائی خدمت گاروں کی تعداد پانچ سو تک تھی۔ پھر جب ہم جیل خانوں سے رہا ہو کر اپنے علاقوں میں گئے تو خدائی خدمت گاروں کی تعداد پچاس ہزار تک جا پہنچی تھی۔ ہماری اس تحریک کا حقیقت میں پروپیگنڈہ انگریزوں نے خود کیا تھا۔ انگریز اپنی فوجیں لے کر دیہات میں چلے جاتے تھے گاؤں کو اپنے گھیرے میں لے لیتے تھے اور لوگوں کو ان کے گھروں سے باہر نکال لیتے تھے انہیں دھوپ میں بٹھاتے تھے اور انہیں کہتے تھے ''شاباش! انگوٹھے کا نشان لگا دو کہ تم خدائی خدمت گار نہیں ہو''۔

لوگ کہتے رہ جاتے تھے کہ ہم تو واقعی خدائی خدمت گار نہیں ہیں اور درحقیقت وہ خدائی خدمت گار ہوتے بھی نہیں تھے، لیکن یہ فرنگی انہیں کہتے کہ بس انگوٹھا لگا دو، لیکن وہ انگوٹھا نہیں لگاتے تھے انگریزوں کے اس سلوک کا ملک بھر میں عورتوں، مردوں پر ایسا اثر ہوا کہ اگر کسی نے انگوٹھا لگایا ہوتا تو عورت مرد اسے ہتک آمیز نگاہ سے دیکھتے تھے ہمارے گاؤں میں ایک آدمی نے انگوٹھا لگا دیا۔ جب وہ گھر گیا تو اس کی بیوی کپڑے دھو رہی تھی۔ کپڑے دھونے والا ڈنڈا ابھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اپنے خاوند سے پوچھا ''تم کس طرح گھر آ گئے ہو''؟

اس نے بیوی کو جواب دیا ''مجھے انہوں نے چھوڑ دیا ہے''

عورت نے پھر پوچھا ''اور لوگوں کو تو چھوڑا نہیں تمہیں کیسے چھوڑ دیا تم ذرا مجھے اپنا یہ انگوٹھا تو دکھاؤ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے انگوٹھا لگا دیا ہے''۔

یہ کہہ کر اس عورت نے وہی کپڑے دھونے والا ڈنڈا اٹھالیا اور اپنے مرد کو آگے لگالیا اور اسے کہا ''اچھا بے غیرت انسان تم نے انگوٹھا لگا دیا ہے اب میں جاتی ہوں''۔

بیوی کی اس پھٹکار نے مرد کے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔ وہ آدمی موقع پر چلا گیا اور پھر دوسرے لوگوں کے ساتھ قطار میں بیٹھ گیا۔

انگریز نے اسے پہچان پر پوچھا ''ارے تم پھر کیوں آ گئے؟''

اس نے جواب دیا ''صاحب! میری عورت مجھے گھر میں نہیں گھسنے دیتی''۔

ایک اور اسی قسم کا واقعہ ہوا ہمارے گاؤں کے حاجی شاہنواز خاں نے جو ہمارے ساتھ جیل خانے میں قید تھے۔ ضمانت داخل کر دی تھی اور رہا ہو گئے تھے لیکن جونہی گاؤں میں گھر پہنچے تو لوگوں کے طعن و تشنیع سے اتنے شرمندہ اور نادم ہوئے کہ ان کے لیے زندگی بوجھ بن گئی اور انہوں نے خودکشی کر کے امان پائی۔

☆☆☆

مسلم لیگ سے رابطہ اور ناکامی

ہمارے جو ساتھی ہماری ملاقات کو آئے تھے ان کے ذریعے ہمیں اپنے صوبے کے حالات سے آگاہی ہوگئی۔ اب ہم نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ہمارے یہ ساتھی واپس اپنے گاؤں میں نہ جائیں بلکہ یہ لاہور، دہلی اور شملے چلے جائیں اور ہمارے ان مسلمان بھائیوں کو جو مسلم لیگ میں ہیں اپنے حال سے آگاہ کریں اور انہیں کہیں کہ وہ ہماری امداد کریں اور انہیں تو کم از کم دنیا کو ہمارے حالات سے تو باخبر کردیں ہمارے ساتھی چلے گئے اور دو مہینے کے بعد واپس پھر گجرات آئے اور جیل میں ہم سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران انہوں نے بتایا کہ وہ ہندوستان میں مسلم لیگ کے لیڈروں کے پیچھے بہت گھومتے پھرتے رہے لیکن مسلم لیگی لیڈر ہماری امداد کے لیے تیار نہ ہوئے۔ کیونکہ ہماری لڑائی انگریزوں سے تھی اور وہ انگریزی کے ساتھ لوہا لینے کے قابل نہ تھے۔ انہیں تو انگریزوں نے ہندوؤں سے لڑانے بھڑانے کے لیے محفوظ رکھا ہوا تھا۔

☆☆☆

کانگرس کے ساتھ الحاق

اس وقت تک ہم کانگرس میں نہیں تھے اور نہ ہی ہماری کانگرس سے کسی قسم کی جان پہچان تھی ۔ایک آدمی جو دریا میں ڈوب رہا ہو بہا جا رہا ہو وہ تو ہر ایک بوٹے پر ہاتھ ڈالتا ہے ہم جب مسلم لیگ سے مایوس ہو گئے تو ہم نے اپنے ان ساتھیوں سے کہا کہ اب تم لوگ جاؤ اور کانگرس کے رہنماؤں سے ملو۔اگر وہ ہماری مدد کریں تو ہم پر ان کا بڑا احسان ہوگا۔وہ چلے گئے کانگرسی رہنماؤں سے ملے۔کانگرسی رہنماؤں نے ہمارے ساتھیوں سے کہا کہ اگر ہم لوگ ان ک ساتھ ہندوستان کی آزادی میں شریک ہونا منظور کرلیں تو وہ ہماری ہر طرح سے امداد کرنے کے لیے تیار ہیں۔

کانگریسی رہنماؤں کا یہ پیغام لے کر ہمارے ساتھی پھر ہمیں آ کر ملے اور ہمیں کانگریس کا یہ پیغام پہنچا دیا۔اب ہم نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے صوبے میں جائیں یہ ماعمہ صوبے کے خدائی خدمت گاروں کے جرگے میں پیش کریں۔وہ چلے گئے ۔انہوں نے جرگہ بلا لیا۔اور جرگے کے سامنے یہ سب باتیں رکھ دیں ۔اہل جرگہ نے کانگریس کی بات قبول کر لی اور فیصلہ کیا کہ اگر کانگریس کے رہنما ہماری مدد کرتے ہیں تو ہم بھی ان کے ہمنوا بنیں۔چنانچہ انہوں نے کانگریس میں شرکت کا اعلان کر دیا۔

انگریز کو یہ خبر ملی تو ہم پٹھان لوگ بحثیت مجموعی کانگریس میں شامل ہو گئے ہیں تو انہوں بنے اپنی بے وقوفی محسوس کی اور ایسا ہوش ٹھکانے آیا کہ انہوں نے میرے

پاس پیغام بھیجا ''آؤ ہمارے ساتھ صلح کرلو۔ جو اصلاحات ہم نے ہندوستان میں کی ہیں فی الحال وہ تم لوگوں کو بھی دے دیتے ہیں اور آئندہ جو کچھ ہندوستان کو دیں گے تمہیں اس سے بھی زیادہ دیں گے، لیکن اس شرط پر کہ تم لوگ کانگریس چھوڑ دو''۔

انگریز کا یہ پیغام پر کر ہم نے ان سب سیاسی ساتھیوں کو، جن میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی شامل تھے جمع کیا اور میں نے ان کے سامنے انگریز کی تجویز کا سارا معاملہ بیان کر دیا اور ان سے پوچھا کہ اس معاملے میں ان کی کیا رائے ہے؟ ان میں سے اکثر لوگوں کی رائے تھی کہ اس موقع سے استفادہ کر لینا چاہیے۔ اور ڈپلو میسی سے کام لینا چاہیے۔ انہوں نے کہا ہم یہ شرط منظور کر لیں گے لیکن میں نے ان سے کہا کہ مجھے یہ پیشکش منظور نہیں کیونکہ فرنگی بہت قابل اعتبار قوم ہیں۔ ہم نے کانگریس سے وعدہ کر رکھا ہے ہم اپنا وعدہ نہیں توڑیں گے۔ چنانچہ حکومت کو میں نے جواب دیا کہ چونکہ تم نے ہم پر اعتبار نہیں کیا ہے اس لیے ہم بھی تم پر اعتبار نہیں کرتے۔

کانگریس کے ساتھ ہمارا الحاق ہو جانے سے مرکزی اسمبلی کے اسپیکر جناب وٹھل بھائی پٹیل کی رہنمائی میں کانگریس نے سوبہ سرحد کے واقعات کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی بھیجی۔ وہ کمیٹی جب اٹک کے پل پر پہنچی تو حکومت نے اسے وہیں روک لیا اور کمیٹی کو سرحد میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ کمیٹی کے لوگ واپس چلے گئے۔ وہ راولپنڈی جا کر بیٹھ گئے مظالم کی ایک طویل داستان قلم بند کر لی ہندوستان بھر میں کانگریس کے اثر رسوخ کے ماتحت جو اخبارات تھے ان سب نے

صوبہ سرحد میں توڑے گئے مظالم کی داستانیں لکھنی شروع کر دیں اور ہمارا خوب پراپیگنڈہ کیا۔ اس رپورٹ کو تو انگریز حکومت نے ضبط کر لیا لیکن کانگریس نے اس رپورٹ کے نسخے بڑی بھاری تعداد میں امریکہ اور انگلستان بھیج دیے تھے اور وہاں لوگوں میں تقسیم کرا دیے تھے۔ قصہ خوانی بازار پشاور کی فائرنگ کے بعد مئی کے مہینے میں مردان ضلع تکر نامی گاؤں میں خدائی خدمت گاروں پر دوبارہ فائرنگ ہوئی اور اس کے نتیجے میں بہت لوگ اس فائرنگ سے شہید ہوئے۔ حکومت نے خدائی خدمت گاروں کے حجرے جلا دیے۔ ان میں خان غلام محمد خان آف لوند خوڑ کا حجرہ ولیج کلب بھی شامل تھا۔ اور بہت سے گھروں کو بھی جلا کر خاکستر کیا گیا...... اور بے شمار لوگو کو گرفتار بھی کیا گیا۔ اس کے بعد ضلع بنوں کے ہاتھی خیل وزیروں کے ایک پرامن جلسے پر فوج نے گولیاں برسائی تھیں کئی لوگوں کو شہید کر دیا گیا اور جنہیں گرفتار کیا گیا تھا انہیں چودہ چودہ سال قید کی سزا دی گئی تھی۔ اس کے بعد شہر بنوں کا محاصرہ کر لیا گیا تھا اور شہر کے دروازے بند کر دیے گئے تھے تاکہ شہر سے کوئی شخص اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لیے باہر نہ جانے پائے۔ بنوں شہر کے رہنے والوں کی زندگی کا انحصار بھی دیگر شہروں کی مانند دیہاتوں سے سپلائی پر تھا۔ اسی لیے ڈپٹی کمشنر نے شہریوں پر اس کے دروازے بند کر دیے تھے تاکہ یہ لوگ بھوک پیاس سے اپنے مال مویشی سمیت مر جائیں ان کا خیال تھا کہ ان حالات میں لوگ خود بخود کانگریس کی تحریک اور خدائی خدمت گاری سے باز آ جائیں گے۔ ادھر دیہاتوں میں بھی لوگ ڈر جائیں گے۔

یہاں پر یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ بنوں شہر اور دیہات میں خدائی خدمت گار تحریک بڑے جوش وخروش سے چل رہی تھی۔ **ملک** اکبر علی خاں کو خدا بخشیمیں نے اسی موقع پر اسی نالے کے ذریعے جو ماہر کے دیہات سے داخل ہو کر شہر میں بہتا تھا۔شہر کے لوگوں کو کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ ان کے مویشیوں کے لیے گھاس کے انباروں کے انبار سپلائی کیے اور ان کی حفاظت کا انتظام بھی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنوں کے لوگوں کو چنداں تکلیف نہ پہنچی اور انسان زندگیوں کے علاوہ جانور بھی ضائع ہونے سے بچ گئے۔ڈپٹی کمشنر کا تباہ کن و غیر انسانی منصوبہ **ملک** صاحب مرحوم نے شرمندہ تکمیل نہ ہونے دیا۔لہذا مجبور ہو کر اسے محاصرہ اٹھا دینا پڑا۔

☆☆☆

رب نواب خان کی بہن کی بہادری کا قصہ

گاندھی ارون پیکٹ ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی ہمارے گاؤں اتمان زئی میں جلسے پر حکومت نے فائرنگ کر دی۔ قصہ یوں ہوا کہ ہمارے گاؤں میں خدائی خدمت گاروں کا جلسہ ہو رہا تھا کہ فوج نے آ کر چاروں طرف سے جلسہ گاہ کو گھیر لیا اور لوگوں سے کہا کہ منتشر ہو جائیں۔ لیکن لوگ منتشر نہیں ہو تے تھے۔ تب ان پر گولی چلا دی گئی۔ کچھ لوگ گولیاں کھا کر شہید ہو گئے۔ لیکن اتنے ظلم وستم کے باوجود انگریز ہمارے جلسے بند نہ کر سکے۔ اور جب جلسے ہوتے تھے تو فوجوں اور رسالوں کے ذریعے منتشر کیے جاتے تھے۔ خدائی خدمت گار کہتے تھے کہ ان فوجیوں میں سکھوں اور آفریدیوں کی ہمارے ساتھ بڑی ہمدردی رہا کرتی تھی۔ لیکن ہماری بھائی بنگش اور خٹک ہم پر ذرا بھی رحم نہیں کھایا کرتے تھے بلکہ ہمیں بڑی بڑی بیدردی سے زدوکوب کیا کرتے تھے۔ اتمان زئی کے جلسے میں فائرنگ کے وقت گولیوں کی بوچھاڑ اتنی تھی کہ آخر نہتے پر امن لوگ مجبور ہو گئے کہ جلسے کی جگہ کو چھوڑ دیں اور منتشر ہو جائیں۔

یہاں بھی ایک عجیب وغریب واقعہ ہوا۔ کہ جلسے کی رونق دیکھنے کے لیے بہت سی عورتیں اور لڑکیاں آئی ہوئی تھیں۔ ان میں رب نواز خاں کی ایک جواں سال بہن بھی تھی۔ وہ بجائے اس کے کہ فائرنگ کی وجہ سے جلسہ گاہ سے دور بھاگتی الٹا محشر خیز میدان کی طرف جدھر سے فائرنگ ہو رہی تھی دوڑ پڑی۔

جلسے سے بھاگنے والے لوگوں نے اسے آوازیں دیں ''اے بہن! کہاں جا رہی ہو۔ خدا کیواسطے دیکھو تو سہی یہ کیا حال ہو رہا ہے۔ رک جاؤ بہن ادھر تو قیامت بپا ہے خدارا کیا کرتی ہو رکتی کیوں نہیں؟''

رب نواز خان کی بہن نے گرج کر جواب دیا ''اسی لیے تو میں نہیں رکتی ادھر جانے سے کہ تم ولگ ادھر سے بھاگے جا رہے ہو۔ مجھے جانے دو تا کہ میں گولی کو سینے پر کھالوں۔ اور فرنگی کو یہ کہنے کا موقع دوں نہ دوں کہ پٹھانوں میں کوئی بھی ایسا انسان نہیں رہا جو اپنے عقیدے کی خاطر موت کو للکار سکے''

اس لڑکی کی غیرت بھری باتوں اور کردار نے لوگوں پر ایسا زبردست اثر کیا کہ تمام لوگ واپس پھر جلسہ گاہ کی طرف لوٹ پڑے۔ انگریزوں نے جب دیکھا کہ یہ لوگ جلسہ گاہ کی طرف آ رہے ہیں تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ وہ ادھر کیوں جا رہے ہیں؟

لوگوں نے جواب دیا ''ہم اپنے آدمیوں کی لاشیں لے جانا چاہتے ہیں تا کہ تم لوگ انہیں تلف نہ کر دو''۔

یہ لوگ اتنی بھاری تعداد میں جمع ہو گئے کہ انہوں نے انگریزی فوج کو اپنے گھیرے میں لے کرانھیں ایسا خوفزدہ کر دیا کہ جلسہ گاہ سے چلے جانے کے لیے فوج کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ انہیں فوج کی تلاشی لینے کی اجازت ہوتا کہ وہ تلاشی لے کر اپنی تسلی کر لیں کہ ان کے کسی شہید کی لاش اپنے ساتھ نہیں لے جا رہی ہے۔ انگریزی فوج نے لوگوں کی یہ شرط مان لی۔ لوگوں نے ہر ایک سپاہی کی تلاشی لی۔

اگر چہ ایک طرف ان کے آدمی مارے گئے تھے لیکن دوسری طرف ان کو بڑی شاندا فتح نصیب ہوئی۔

ہمارے ساتھ انگریز کے اس سلوک اور رویے کی وجہ سے صرف صوبہ سرحد کے لوگ ناراض نہیں تھے بلکہ ایجنسیوں اور قبائلی علاقوں پر بھی زبردست غصہ تھا۔ چنانچہ آفریدیوں نے پشاور میں مکڑی گودام پر مسلح حملہ کر دیا۔ مہمندوں' سیالوں اتمانخیلوں اور ماموندوں اور سالارزئیوں نے شبقدر ڈھیری مٹہ اور دوسرے مقامات پر حملے شروع کر دیے مجاہدین نے لیکنڈی اور سوبان خوڑ میں اپنا مرکز قائم کر لیا تھا۔ اور مہینوں تک انگریزی فوجوں سے ان کی جنگ جاری رہی قبائلیوں کے ان علاقوں پر جہاں انگریز حکومت سے قبائلیوں کی مستقل حد بندی نہیں تھی یا سرحد کی کوئی ایجنسی بیچ میں حائل تھی وہاں وہ جرگوں کی شکل میں انگریزوں کے پولیٹکل ایجنٹوں کے پاس گئے اور انہیں الٹی میٹم دیے کہ مجھے خان عبدالغفار خان کو اور ملنگ بابا گاندھی جی کو فوراً رہا کر دیا جائے سرخپوشوں کو بھی جیل خانوں سے رہا کر دیا جائے۔ پٹھانوں پر ظلم اور زیادتیاں کرنے سے احتراز کیا جائے۔

☆☆☆

پٹھانوں کی دنیا آٹھ حصوں میں تقسیم تھی

اسی قسم کی بغاوت یا طوائف الملکی تمام قبائل میں پیدا ہو گئی تھی اس سلسلے میں ارکائیوز آف انڈیا کے خفیہ ریکارڈ میں واضح اور مفصل تفصیلات موجود ہیں مذکورہ بالا مطالبات کے ساتھ ساتھ قبائلیوں نے انگریزوں کی مسلح جنگ کی دھمکیاں بھی دیں۔ چنانچہ ترکلڑی قوم کا ایک بہت بڑا جرگہ جو ماموندوں اور سالارزئیوں اور اتمان خیلوں پر مشتمل تھا مالاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ سے ملا۔ ان جرگوں کا آنکھوں دیکھا حال لوگوں نے میرے سامنے بیان کیا۔ اس سے پتہ چلا کہ پولیٹکل ایجنٹ نے اس جرگے کے لیے ملاقات کے وقت چائے کا بہت اعلیٰ انتظام کیا تھا۔ جرگے والوں کے سامنے میز پر روپوں کے ڈھیر اور نوٹوں کے بنڈل لگا رکھے تھے تا کہ وہ ان مہمانوں کی عزت کر سکے اور روپوں اور دولت کا لالچ دے کر انہیں مسحور کر سکے لیکن اس جرگے میں کسی نے چائے کا پیالہ منہ سے نہ لگایا صرف یہی نہیں کہ قبائلیوں نے روپوں کے ڈھیروں اور نوٹوں کے انباروں پر نفرت وحقارت سے تھوک دیا بلکہ ان پٹھان غیور بھائیوں کا غیض وغضب اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ جب پولیٹکل ایجنٹ نے ایک خان کے ساتھ جس کا نام بادشاہ خان تھا' ہاتھ ملانا چاہا تو بادشاہ خان نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور کہا۔

''وہ ہاتھ جو میرے پختون بھائیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں انہیں چھو کر میں اپنے آپ کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا''۔

قبائلی سردار بادشاہ خان سالارزئی قبیلے کی پشد قوم کا چشم وچراغ تھا۔

پولیٹکل ایجنٹ نے ان قبائلی سرداروں کی بڑی خوشامد کرتے ہوئے کہا ''مجھے آپ لوگ مہلت دیں کہ میں حکومت ہند کے سامنے آپ کا یہ قومی مطالبہ پیش کر سکوں''۔اس کے بعد وہ چلا بھی گیا۔لیکن میرے قبائلیوں نے جس شفقت کا اظہار فرمایا تھا اور وطن دوستی کا جو ثبوت پیش کیا تھا اس کی خوش گوار یاد ابھی تک میرے ذہن میں تازہ اور محفوظ ہے اور میں اسے مرتے دم تک نہیں بھلاؤں گا۔

انگریزوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں اور اب پاکستان کی حکومت نے بھی ہمیں یہ اجازت کبھی نہ دی کہ ہم اپنے ان قبائلی بھائیوں ایجنسی کے لوگوں اور ریاستوں کے بھائی بندوں سے تعلقات رکھیں اور یا ہم ان کے پاس جائیں اور ان کی غمی وخوشی میں شریک ہوں۔

پشتونوں کا یہ واحد خاندان اور واحد ملک انگریزوں نے مختلف انتظامی حصوں میں بانٹا ہوا تھا۔ایک تو سرحد کو وہ علاقہ جس میں ہم رہتے تھے اور اسے گورنر کا صوبہ کہا جاتا تھا۔دوسرے ایجنسیوں کے علاقے ہوتے تھے جو پولیٹکل ایجنٹ کے براہ راست اختیار میں تھے سوم وہ ریاستیں تھیں جن کا نظام پولیٹکل ایجنٹوں کی وساطت سے ہوتا تھا۔چہارم آزاد قبائل تھے اسی طرح بلوچستان ایک علیحدہ صوبہ تھا جو صوبہ سرحد کی طرح چار طبقوں میں بانٹا گیا تھا۔قصہ کوتاہ یہ کہ پٹھانوں کی یہ دنیا آٹھ حصوں میں منقسم تھی جن میں سے ایک حصہ دوسرے سے ارتباط اور تعلق رکھنے کا مجاز نہیں تھا۔اس سے انگریزوں کی غرض اور اب پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ چھوٹے

چھوٹے ٹکروں اور قبیلوں مین ایک دوسرے سے جدا رکھے جا سکیں اور ہمیں اپنا ایک بھائی چارہ قائم کرنے کیلیے کھلا نہ چھوڑا جائے۔ اس ظلم نے ہمارے **ملک** اور ملت کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ چنگیز اور ہلاکو کی وحشت کو بھی مات کر دیا ہے۔ کیونکہ ان وحشی چنگیز یا ہلاکو نے تو چند ہزار یا لاکھ انسان ہلاک کیے تھے اور مبصداق "بلائے آمد ولے بخیر بگذشت" چلے گئے تھے لیکن اس پالیسی یعنی انگریزی و پاکستان پالیسی کے ہاتھوں تو لاکھوں پشتون جو شاید ایشیا میں ایک مضبوط ملت بنتے اور انسانیت کی عظیم خدمت کرتے تحس نحس ہو کر دنیا کی تاریخ اور صفحۂ ہستی سے بتدریج بنا ہو چکے ہیں۔

میرا تمام تر مجادلہ آج اسی ظلم کے خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس ملت نے کون سا گناہ کیا ہے کہ تاریخ مٹائی جا رہی ہے۔ ان کا **ملک** چھینا جا رہا ہے اور ایک عظیم الشان و شریف النفس قوم کو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ یعنی اسے محکوم کرنے کی ناپاک و ناکام کوشش کی جا رہی ہے۔ میں بلوچستان سے چترال تک پٹھانوں کے بکھرے ہوئے قبیلوں کو رشتہ اتحاد میں منسلک کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ان میں ایک بھائی چارہ پیدا ہو جائے۔ ان کا غم و الم ایک دوسرے کا مشترکہ درد و رنج بن جائے۔ اور انسانیت کی خدمت کے لیے یہ قوم پشتون دنیا میں اپنا قومی رول ادا کر سکے۔ میں شاید شدید رنگ کے احساس کے ساتھ اس بات کی طرف اشارہ کر دوں کی ہمیں غیروں نے بہت غلط رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ مثلاً ایک طرف تو ہم پر سب دروازے بند کر رکھے ہیں تاکہ کوئی ہمارے پاس نہ آ سکے اور دوسری طرف ہمارے دشمن ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ ہم وحشی ہیں اور نہ جانے کیا

کا یا کہیں۔ یہ پروپیگنڈہ ہمارے قبائلہ بھائیوں کے خلاف مختلف طریقوں سے اتنا زیادہ اور زور شور سے جاری ہے کہ انسان کو اس پر افسوس ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی بہادری کی تعریف تو کریں گے لیکن اس بہادری کو وحشت کا رنگ دے دیں گے۔ ان کو آزادی سے پیار ومحبت ہے اس بات کی تعریف تو کری گے لیکن ایسے الفاظ میں کہ شاید ان کو کوئی تنظیم نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی ضابے کے پابند ہیں۔ جب بھی ان کے دل میں آتا ہے وہ انسانوں کو قتل کر دیتے ہیں اور جو بات انہیں پسند ہوتی ہے وہی کرتے ہیں۔ ان کی مہمان نوازی کی صفت تو بیان کریں گے اور بات کو جھوٹ اور مغالطے کی ایک ایسی سرحد پر پہنچا دیں گے...... کہ اپنی مہمان نوازی کی روایات کو برقرار رکھنے کے لیے ہی گویا یہ لوگ قبائلی پٹھان مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ چوریں بھی کریں اور ڈاکے بھی ڈالیں ایک یا دوسری حکوت سے پیسے یا رشوت لیں یعنی یہ کہ وہ جیسے کسی بھی اخلاق کے پابند ہوں اور شتر بے مہار ہوں۔ اسی طور طرقے سے یہ چالاک حکمران اقوام چاہتی ہیں کہ یہ بہر حال پٹھانوں کے ایک شریف طبقے کو دنیا کے سامنے بدنما صورت میں پیش کریں۔ اور انہیں نہ صرف دنیا کی ہمدردی ہی سے محروم رکھیں۔ بلکہ خودغرض حکومت کو جواز، موقع اور بہانہ مہیا کریں کہ وہ انہیں کچھ کر رکھ دے۔ انہیں بموں سے اڑا دے مشین گنوں سے ان کے وجود کو چھلنی چھلنی کر ڈالے ان کے گھر مٹی میں ملا دے۔

یہ پشتون لوگ کئی سو سال سے جوان کی سیاہ بختی کا زمانہ تھا بہت بری طرح سے مبتلائے آلام چلے آتے ہیں۔ مغلوں کے زمانے سے لے کر انگریزوں تک اور پھر

انگریزوں کے زمانے سے لے کر آج کی حکومت پاکستان تک سب نے ان لوگوں سے قبائلی پٹھانوں سے یکساں وحشیانہ سلوک کیا۔ انہیں پہاڑوں کے سنگین اور سخت ترین داموں اور سوکھے میدانوں میں ایسے رکھا گیا ہے یا رہنے پر مجبور کیا گیا ہے کہ جیسے وہ قلعے میں رکھنے کے لائق اسیر ہوں۔ یعنی ان کو نہ تو ان کی زمین سے کچھ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی یہ لوگ تجارت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تجارت کے لیے تو زمانہ حال میں ذرائع آمد و رفت اور مواصلات کی ضرورت ہوتی ہے انہیں کسی سے کسی قسم کی صنعت و حرفت میں بھی تربیت حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ کیونکہ صنعت کی ترقی و تربیت کے لیے تو ایک طویل و پرامن دور کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کا ئی سو سالوں سے ان کے لیے قحط ہے ان پر روزانہ بمباری ہوتی ہے۔ جنگ ہوتی ہے اور ان کا قتل عام ہوتا رہتا ہے۔ یہ علاقہ گویا سامراجی طاقتوں نے اپنی فوجوں کی عملی تعلیم و تربیت کے لیے ایک طرح سے میدان جنگ بنا رکھا ہے۔ ان لوگوں کو نہ تو کسی نے کبھی تعلیم دی ہے اور نہ ہی ان کے لیے کوئی ہسپتال قائم کیا گیا ہے۔ تا کہ وہ اپنی ادنیٰ سی بیماری کا بھی علاج کرا سکیں۔ ریدی گل خوبصورت خودرو صحرائی پھول کی مانند یہ لوگ پیدا ہو کر پلتے ہیں اور پھر ویسے ہی جنگل اور پہاڑ میں مٹی میں مل جاتے ہیں۔ نہ تو انہیں روٹی میسر ہے اور نہ پانی' نہ کھیت کیاری ہے اور نہ باغ باغیچہ نہ بازار ہیں اور نہ تجارتی منڈیاں نہ زندگی ہے اور نہ ہی زندگی کی ضروریات و لوازمات۔ میں نہیں سمجھتا کہ سنگدل دنیا ان سے چاہتی کیا ہے؟ بجائے اس کے کہ انسانیت کے ناطے ان لاکھوں خوبصورت لڑکیوں اور غیور نوجوانوں پر رحم کرے اس

نے ان کے پیچھے مردم خور لگا دیے ہیں اور اس پر ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے انہیں بے عزت بھی کیا جاتا ہے اور پیچھے سے گالیاں بھی دی جاتی ہیں

میری دوسری آرزو یہ ہے کہ ان شریف بہادر، وطن دوست، غیرتی اور رنگ و ناموس کے پروانوں یعنی پٹھانوں کو غیروں کے ظلم و استبداد سے بچالوں اور ان کے لیے ایک ایسی آزاد دنیا بنا دوں کہ جہاں وہ کھیلتے ہوئے آسودہ زندگی بسر کرسکیں میں چاہتا ہوں کہ ان کے ان ویران اور مسمار گھروں کے ڈھیلوں اور مٹی کو چوم لوں جو وحشی انسانوں نے برباد کیے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے گلی کوچے اور گھر وراپنے ہاتھوں سے جھاڑو لے کر صاف کر دوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے خون کے لت پت کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھوؤں اور پھر یہ خوبصورت انسان دنیا کے سامنے کھڑے کر دوں اور دنیا سے کہوں کہ ''آؤ اب مجھے ان سے زیادہ شریف شائستہ اور متمدن انسان کوئی ہو تو دکھا دو''۔

☆☆☆

گجرات جیل سے رہائی

خیر ذکر گاندھی ارون پیکٹ کا چل رہا تھا۔ جب یہ پیکٹ ہو گیا تو تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے۔ صرف ایک میں ہی اکیلا تھا جسے رہا نہ کیا گیا اور میں گجرات کے جیل خانے میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے پوچھا کہ ''مجھے کس لیے بند رکھا گیا ہے؟''

انہوں نے مجھے بتایا ''یہاں مسلم لیگ رہنماؤں کی ایک کمیٹی آ رہی ہے جس میں سر فضل حسین اور سر صاحبزادہ عبدالقیوم بھی شامل ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں''

میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا ''میں تو ان سے ملنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ جب ہم پر مصیبت تھی تو انہوں نے ہماری کوئی مدد نہ کی۔ اس وقت تو انہوں نے مجھے فراموش کر رکھا تھا۔ اور اب جب مجھے راحت میسر آنے لگی ہے تو میں انہیں یاد آ گیا ہوں۔ آپ مہربانی فرمائیں انہیں اطلاع دے دیں کہ وہ یہاں تشریف نہ لائیں لیکن اگر وہ آ بھی گئے و میں ان سے ملاقات نہیں کروں گا''۔

ادھر ہمارے لوگ پٹھان مہاتما گاندھی کے پاس گئے اور انہیں اس بات سے آگاہ کیا ''جہاں سب سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا ہے وہاں عبدالغفار خان کو رہا کرنے کا نام ہی نہیں لیا جاتا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ سرح کے چیف کمشنر سر سٹورٹ پیرسن نے وائسرائے کو لکھا ہے کہ صوبہ سرحد میں دو آدمی بیک وقت نہیں رہ

سکتے ۔یا تو عبدالغفار خان رہے گا اور یا میں رہوں گا''۔

یہ اطلاع پا کر مہاتما گاندھی لارڈ اروِن کے پاس گئے اور ان سے کہا ''عبدالغفار خان کو بھی رہا کر دیجیے کیونکہ وہ ہماری کانگریس کا ممبر ہے''۔

لارڈ اروِن اچھے آدمی تھے۔انہوں نے گاندھی جی سے کہا ''پٹھان اور عدم تشدد ناممکن ۔آپ کو چاہیے کہ صوبہ سرحد میں جائیں اور اپنی آنکھوں سے حالات کا مطالعہ کریں کہ پشتون کس حد تک عدم تشدد کے قائل ہیں''۔

یہ کہنے کے باوجود لارڈ اروِن نے میری رہائی کے احکام جاری کر دیے اور میں رہا ہو گیا۔ اب میں اپنے صوبے میں آ گیا۔ یہاں کے حالات اور لوگوں کے جذبات دیکھے یہ بڑے سازگار تھے۔ میں نے بسم اللہ کر دی اور اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ایک منٹ بھی رایگاں نہیں جانے دیا۔لوگوں میں ہمت اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے جب کبھی میں تقریر کرتا تو اس بات پر بہت زور دیا کرتا کہ ''فرنگی کا ایک سینگ ٹوٹ گیا ہے پختونو! اٹھو کمر کس لو اور اسکا دوسرا سینگ بھی توڑ دو یہ **ملک** تمہارا ہے اور خدا نے تمہارے بچوں کو عطا کیا ہے۔لیکن آج تمہاری بے اتفاقی خود غرضی کی وجہ سے انگریز تمہارے **ملک** کو ہڑپ کر رہے ہیں۔ حالانکہ خدا کا دیا ان کا اپنا **ملک** بھی ہے۔مگر تمہارے وطن کو بھی کھا رہے ہیں۔تمہارے بال بچے بھوکے پیاسے مر رہے ہیں اور تمہارے **ملک** کی بدولت ان کے بچے گلچھڑے اڑا رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں''۔

میری تقریر کے اس جملے ''فرنگی کا دوسرا سینگ بھی توڑ دو'' نے انگریز کو تیخ پا کر

دیا۔ اسنے میرا ساتھیوں میں میرے خلاف پروپیگنڈہ کرنا ''عبدالغفار صلح صفائی یا مفاہمت نہیں چاہتا بلکہ بگاڑ پیدا کرتا ہے اس کی باتوں کا نتیجہ یہ وہو گا کہ تم سب پر مصیبت آجائے گی'

انگریز نے ہمارے بعض ساتھیوں کے دماغ میں یہ بات بھی بٹھانے کی کوشش کی ''تم لوگ بڑے قابل اور لائق ہو اور یہ عبدالغفار خان تمہاری طرح عالم نہیں ہے کام تم لوگ کرتے ہو مگر نام اسکا ہوتا ہے۔

اس قسم کے پروپیگنڈے کا اثر ہمارے ساتھیوں پر بھی ہوا۔ اور ان کے چند ایک لیڈر جمع ہوئے انہوں نے مردان میں ہمارے قاضی عطاء اللہ خان کے یہاں ایک میٹنگ کی اور اس میٹنگ میں مجھ سے کہا کہ ایک تو آپ اپنے یہ دورے ملتوی کر دیں اور دوسری سینگ ٹوٹ جانے کی بات مت کیجیے"

میں نے کہا ''اچھا آخر لوگوں سے کیا کہوں گا''۔

انہوں نیکہا ''ہم نے ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ اب ایسی بات نہیں کرنی چاہیے''۔

میں نے انہیں کہا ''اس سے تو پٹھانوں میں وہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا جو میں ان میں پیدا کرنا چاہتا ہوں''۔

انہوں نے پھر زور دیا کہ میں دورے کرنا بند کر دوں میں نے رائے ظاہر کی ''یہ معاہدہ مفاہمت پائیدار نہیں ہے۔ یہ جلد بازیا بدیر ٹوٹنے والا ہے۔ خیر خدا نے ہمیں کام کرنے کے واسطے ایک اچھا وقت دیا ہے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے''۔ لیکن

بعض آدمیوں پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ وہ خود تو کام کرتے نہیں تھے اور مجھے بھی کام نہیں کرنے دیتے تھے کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ مجھے گرفتار کیا جائے گا تو وہ بھی میرے ساتھ دھر لیے جائیں گے۔ اور وہ قید ہونے اور جیل جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

قاتلانہ حملہ

کراچی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس تھا۔ ہمیں اس میں شرکت کرنے کے لیے دعوتیں آتی تھیں۔ اور یہ پہلی کانگریس تھی جس میں ہم شامل ہو رہے تھے۔ ہمارے ہمارہ اسی یا ایک سو خدائی خدمت گار جنہوں نے خوبصورت اور پرکشش سرخ وردیاں زیب تن کی ہوئی تھیں اپنے ساز و سامان سے لیس ہو کر کراچی کے لیے روانہ ہوئے اور بڑی دھوم دھام لیس کراچی پہنچ گئے۔ راستے میں ہم نے خوب پراپیگنڈہ کیا۔ جس سٹیشن پر گاڑی کھڑی ہوتی ہمارے خدائی خدمت گار اپنے ساز و سامان کے ساتھ نیچے اترتے اور اپنا پروپیگنڈہ کرتے۔

کراچی میں کانگریس نے ہمیں ایک علیحدہ کیمپ دیا۔ جو خاص طور پر ہمارے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ ہمارے خدائی خدمت گار ڈیوٹی بڑے شوق اور بہادرانہ انداز مں دتے تھے۔ ان کے اندر زبردست احساس اور ڈسپلن بھی تھا۔ اور جلسوں میں جس جگہ ڈیوٹی دینا مشکل نظر آتا وہاں خدائی خدمت گاروں کو ڈیوٹی لگائی جاتی تھی۔ اور وہ اپنا فرض منصبی بڑی خوبی اور شان سے ادا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ہمارے والنٹیر لوگوں میں بے حد ہر دل عزیز ہو گئے تھے۔ اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس موقع پر گاندھی جی، جواہر لال جی اور کانگریس کے دوسرے بڑے بڑے لیڈروں سے ہماری جان پہچان ہو گئی۔ ان قومی رہنماؤں سے ہمیں بات چیت کرنے کا موقع بھی ملا۔

دہلی میں ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا تھا۔ میں بھی ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا اور اس جلسے میں شامل ہوا تھا۔ جواہر لال جی سے میری واقفیت نہیں تھی اور نہ ہی وہ مجھے جانتے تھے۔ اس وقت تک ہم ایک دوسرے کے دوست و آشنا نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی ایک دوسرے کی طبیعتوں سے واقف تھے۔ جواہر لال جی نے مجھے علیحدہ کر کے کہا ''ہم پشاور ورکنگ کمیتی کے دفتر کو خرچ کے لیے پانچ سو ماہوار دیا کرتے ہیں اور اب آپ لوگوں کے جرگے کے دفتر میں ایک ہزار روپے ماہوار دیا کریں گے''۔

میں نے انہیں کہا ''پنڈت جی ہمیں روپوں کی ضرورت نہیں پھر ہم آپ سے روپے کیوں لیں کیا یہ ملک صرف آپ ہی لوگوں کا ہے ہمارا نہیں اور اس کے لیے قربانی کرنا صرف آپ ہی کا فرض ہے ہمارا نہیں۔ یہ آپ کا اور ہمارا سب کا مشترکہ فرض ہے۔ لہٰذا آپ اپنا بوجھ اٹھایئے اور ہم اپنا بوجھ اٹھائیں گے۔ اور اگر آپ لوگ ہماری امداد کرنا چاہتے ہیں تو آپ ہماری لڑکیوں کے لیے ایک سکول بنوا دیجیے اور اسکے ساتھ ایک چھوٹا سا ہسپتال بھی ہو''۔

جواہر لال جی میری اس بات پر خفا ہو گئے اور مجھے تو کچھ نہیں کہا لیکن ڈاکٹر انصاری صاحب سے شکایت کی کہ باچا خان بہت مغرور شخص ہے۔ جب میں ڈاکٹر انصاری سے ملا تو انہوں نے مجھ کہا کہ میں نے جواہر لال جی کو کس لیے خفا کیا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں نے تو ان سے خفگی ک کوئی ایسی بات نہیں کی۔ میں تو ایک خدائی خدمت گار ہوں اور خدائی خدمت گاری اور تکبر دو متضاد چیزیں ہیں۔ میں

نے ڈاکٹر انصاری کو اپنی ساری بات سمجھا دی اس کے بعد ہم اور جواہر لال جی ایک دوسرے کی طبیعتوں سے واقف ہو گئے۔ پھر ہم نے اپنے باہمی تعلقات میں اس قدر پریم' پیار اور محبت پیدا کر لی کہ دو بھائیوں میں بھی اتنا پریم پیار پیدا نہیں ہو گا۔ دراصل مجھے پیسوں کی بات بڑی مکروہ نظر آتی ہے اور میں نے اپنی ساری عمر میں کسی کے آگے پیسے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبر ریل کرایہ پر لیا کرتے تھے اور جواہر لال جی نے اس بات پر بھی مجھ سے بڑی لڑائیاں لڑیں۔ لیکن میں نے کبھی کرایہ نہیں لیا تھا۔

کراچی سے واپس آ کر میں نے اپنا دورہ شروع کر دیا اور جب ہم کوہاٹ پہنچے اور ضلع کوہاٹ کا دورہ شروع کیا تو بھرتی کرنے والے انگریزوں نے حکومت سرحد کے ذریعے وائسرائے سے میری شکایت کرتے ہوئے لکھا ''کوہاٹ تو ہمارا بھرتی کا ایک مرکز ہے اس لیے ہم عبدالغفار خان کو اس ضلع میں دورے نہیں کرنے دیں گے۔ اور اگر وہ آئے گا تو ہم اسے گرفتار کر لیں گے''۔

ان دنوں لارڈ ارون چلے گئے تھے اور ان کی جگہ لارڈ لنگڈن آ چکے تھے۔ اب وہ ہندوستان کے وائسرائے تھے لارڈ ولنگٹن نے گاندھی جی کو لکھا کہ وہ مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں گاندھی جی نے انہیں جواب دیا۔

''عبدالغفار کو ہرگز گرفتار نہ کیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہماری معاہدہ گاندھی ارون پیکٹ ٹوٹ جائے گا۔ لارڈ ارون نے مجھے کہا تھا کہ سرحد جا کر پٹھانوں کے طور اطوار اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں اس لیے آپ مہربانی فرما کر مجھے

سرحد جانے کی اجازت دیجیے تاکہ میں ان لوگوں کو دیکھ لوں"۔

لیکن لارڈ ولنگڈن نے مہاتما گاندھی کو سرحد جانے کی اجازت نہ دی۔ اس پر گاندھی جی نے لارڈ ولنگڈن کو لکھا کہ اگر وہ انہیں سرحد جانے کی اجازت نہیں دیتے تو پنڈت نہرو کے لیے اجازت دیں تاکہ وہ سرحد جا کر صورت حال کا مطالعہ کریں لیکن وائسرائے نے نہرو کے لیے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ تب گاندھی جی نے اپنے بیٹے دیوداس کا نام تجویز کیا۔ تب بار بار کے اصرار سے وائسرائے نے دیوداس کو صوبہ سرحد جانے کی اجازت دے دی۔

دیوداس پشاور پہنچ گئے پشاور سے ہم لوگوں نے انہیں اپنے ساتھ لے کر اتمان زئی روانہ ہونا تھا۔ ہم اتمان زئی کے ایک لاری میں بیٹھ گئے۔ جب یہ لاری شاہی باغ سے آگے بڑھی تو ہمارے ایک دوست کی موٹر کار پہنچ گئی۔ لاری رکوائی گئی ارو ہم لوگ لاری سے نیچے اتر کر موٹر میں سوار ہو گئے۔ موٹر کی اگلی سیٹوں پر دو خدائی خدمت گار بیٹھے ہوئے تھے وہ موٹر چلا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی خوبصورت اور پرکشش سرخ وردیاں پہن رکھی تھیں اور ہماری موٹر پر جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ میں دیوداس اور خورشید بہن پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ جب ہم چارسدہ پہنچے تو ہمیں خبر ملی کہ ہماری لاری پر حملہ کرنے کے لیے ایک ڈاکو جو قاضی کے نام سے مشہور تھا سردریاب کے پل کے قریبی جنگل میں بیٹھا ہوا ہے۔ جب وہ لاری پل کے قریب پہنچی تو اس ڈاکو نے اس پر گولیاں چلائیں۔ اس لاری کو روک کر اسکی تلاشی لی گئی لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ اس سانحے میں ڈاکو کی گولی سے ایک مسافر زخمی ہو گیا جسے

ہم نے خود چارسدہ کے ہسپتال میں زیر علاج دیکھا تھا۔ اس سے بات چیت بھی کی تھی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ لاری پر ڈاکو کا حملہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ہوا تھا۔ ڈاکو قاضی کو حکومت کے مشورے سے قلی خان سے بلوایا گیا تھا اور اس جنگل میں ہمیں مروا ڈالنے کے لیے ہی بٹھا رکھا تھا۔ ۔ ہم پشاور سے تو اسی لاری میں سوار ہو کر روانہ ہوئے تھے حکومت نے ناکی تھانے کے ذریعے اس ڈاکو کو خبر کر دی تھی کہ اس لاری میں ہم لوگ سفر کر رہے ہیں۔ یہ تو خدا کا فضل تھا کہ اتفاقاً ہمیں راستے میں ایک دوست کی کار مل گئی تھی اور ہم لاری سے اتر کر موٹر میں سوار ہو گئے تھے لیکن اس ڈاکو کو تو یہ اطلاع نہیں مل سکی تھی ہم اس لاری سے راستے میں اتر گئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سرکار کی یہ سازش ناکام ہو گئی۔ لیکن اس سازش کی ناکامی سے سارا راز عوام پر عیاں ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا جیسا کہ میں نے بعد میں سنا تھا کہ وہ ڈاکو جب آفریدیوں میں پہنچا تو آفریدیوں نے اسے محض اس وجہ سے قتل ڈالا کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے ہمیں قتل کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ آفریدیوں کے نزدیک قاضی یہ یہ حرکت پشتو یولی پٹھانی روایات کے سخت خلاف تھی۔ ان کو غصہ تھا کہ اگر اس سانحے میں مہاتما گاندھی کا فرزند قتل ہو جاتا تو اس سے پشتونوں کی بدنامی ہندوستان بھر میں ہوتی جو انہیں برداشت نہیں تھی۔ خیر ہم بخیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچے اور اس کے بعد دیوداس نے ہمارے سارے علاقے کا دورہ کیا اور ہم نے انہیں سب کچھ دکھایا اور وہ سمجھ گئے کہ قومی کام کرنے کی وجہ سے ہی انگریز ہم سے

ناراض اور مغلوب الغضب تھے۔

اس زمانے میں ہمارے صوبے میں مسلم لیگ کا وجود نہیں تھا۔ انگریزوں کو ہماری جماعت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک پارٹی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ہمارے مقابلے کے لیے انگریزوں نے خاکسار پارٹی قائم کر دی۔ اس وقت عنایت اللہ خان مشرقی پشاور کے گورنمنٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ گورنمنٹ نے انہیں اعتماد میں لیا اور اسی کے ذریعے انگریزوں نے ہماری جماعت کے مقابلے میں خاکسار تحریک جاری کی لیکن خدائی خدمت گار تحریک ملک میں بہت ہر دل عزیز تھی اس لیے خاکسار تحریک صوبہ سرحد میں ترقی نہ کر سکی۔ لیکن ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جلد پھیل گئی۔ بعد میں عنایت اللہ کان مشرقی کی کمزوری اور لکھنو میں معافی مانگنے کی وجہ سے یہ تحریک ختم ہوگئی۔ اسی طرح اور تحریکیں بھی ہمارے صوبے میں جاری ہوئی تھیں لیکن خدائی خدمت گار تحریک کا مقابلہ کوئی دوسری تحریک نہ کر سکی اور وہ اپنی موت آپ مر گئیں۔

حقیقت یہ تھی کہ ایک طرف تو ہم اپنے صوبے میں خوب کام کرتے تھے اور دوسری طرف خدائی خدمت گار تحریک صوبہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جاتی تھی۔ صرف کوہاٹ کے ضلع میں ہمارے خدائی خدمت گاروں کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ انگریز اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور اس فکر میں تھے کہ مجھے گرفتار کر لیں۔ میں پورے زور سے اس کے لیے کام کر رہا تھا مجھے علم تھا کہ میں کسی بھی وقت گرفتار کر لیا جاؤں گا کیونکہ انگریز کوشش کر رہے تھے کہ گاندھی جی کو میری گرفتاری کے لیے

رضامند کرلیں لیکن گاندھی جی ان کی یہ بات نہیں مانتے تھے۔اس معاملے کو لے کر گاندھی جی اور وائسرائے ہند کے مابین کشمکش جاری تھی۔گاندھی جی بے حد مجبور ہو گئے اور انہوں نے میرے پاس ایک آدمی بھیج دیا کہ میں ان کے گاندھی جی کے پاس چلا جاؤں۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

گاندھی جی سے ملاقات

ان دنوں گاندھی جی باردولی میں تھے۔ میں باردولی روانہ ہو گیا۔ راستے میں بھوپال کے ریلوے سٹیشن پر محمد علی صاحب کے داماد شعیب قریشی نے دیکھ لیا۔ یہ ہمارے ساتھ خلافت میں کام کرتے تھے۔ اس وقت وہ بھوپال ک نواب کے سات تھے۔ شعیب نے مجھے وہاں اترنے پر مجبور کر دیا اور میں ایک رات کے لیے بھوپال میں ٹھہر گیا۔ رات کو انہوں نے مجھے نواب بھوپال کا مہمان بنایا۔ شوکت علی صاحب بھی انہی کے مہمان تھے۔ نواب صاحب نے تنہائی میں میرے ساتھ طویل گفت و شنید کی اور آخر میں مجھے کہا کہ اگر میری مرضی ہو تو وہ دونوں وائسرائے کے پاس چلے جائیں گے ان سے ملاقات کر لیں گے۔ اور نواب صاحب نے یہ قوی امید ظاہر کی کہ میں جو کچھ بھی پشتونوں کے لیے مانگوں گا وائسرائے صاحب ضرور دے دیں گے۔ لیکن میں نے وائسرائے کے پاس جانے کے لیے انکار کر دیا اور میں نے نواب صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے اتنا یقین ان پر نہیں ہے اور دوسرے اس وقت میں باردولی جا رہا ہوں۔

جب باردولی پہنچ گیا تو مہاتما جی سے میں نے گفت و شنید کر لی اور میں نے انہیں یہ کہہ دیا کہ "یہ سب بہانے و حیلہ سازیاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت مجھے کام نہیں کرنے دیتی اور اچھا ہے کہ آپ (گاندھی جی) وائسرائے ہند کو لکھ دیں کہ جن لوگوں نے مجھ پر الزامات لگائے ہیں ان کو وائسرائے ہند بلا لیں۔ وہ لوگ وائسرائے اور

آپ (گاندھی جی) کے سامنے میرے خلاف الزامات کے ثبوت پیش کریں۔ آپ دونوں جج بن جائیں اور اگر میرے خلاف ثبوت مل جائے یعنی الزامات ثابت ہو جائیں تو آپ دونوں مجھے جو سزا دیں گے وہ مجھے بسر و چشم منظور ہوگی۔

گاندھی جی نے وائسرائے کو میری یہ تجویز لکھ دی اور اس کے ساتھ دوسری بات یہ لکھی کہ اگر وائسرائے صاحب انہیں اجازت دیں تو وہ خود سرحد جا کر اپنی آنکھوں سے تمام حالات اور واقعات دیکھ لیں۔ اگر وائسرائے صاحب چاہیں تو وہ گاندھی جی کے ساتھ لے کر وائسرائے کے پاس شملہ پہنچ جائیں تو ایسا کیا جائے۔

یہ گرمی کا موسم تھا اور ان دنوں وائسرائے شملہ میں تھے۔ کچھ دن مجھے گاندھی جی نے وائسرائے کے جواب کے لیے ٹھہرائے رکھا۔ اسی اثنا میں وائسرائے کی طرف سے جواب یہ ملا کی مہاتما گاندھی کو مجھے ساتھ لے کر شملہ آنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی موجودہ وقت مں گاندھی جی کا سرحد جانا وائسرائے مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ جواب ملنے پر مہاتما جی مان گئے کہ واقعی میری بات سچی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ اب میں جا کر اپنا کام کر سکتا ہوں۔

شملہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ تھی میں بھی اس کے لیے گیا تھا۔ دو خدائی خدمت گار بھی میرے ساتھ تھے گاندھی جی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے لیے لندن جا رہے تھے اس کے بارے میں کچھ صلاح و مشورہ کرنا تھا۔ گاندھی جی چلے گئے۔ اور ہم لوگ شمل میں ٹھہر گئے۔ ہمارے ساتھ اسلامیہ کالج کا ایک نوجوان تھا جس کا باپ انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ میں ایک بڑا افسر تھا۔ اس نے مجھے سیسل ہوٹل شملہ میں اپنا مہمان

بنایا اور میرے ساتھ فیروز خان نون اور پنجاب کے چند معززین بھی کھانے پر بلائے۔ جب ہم کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں داخل ہو رہے تھے تو میرے ساتھ خدائی خدمت گار بھی تھے وہ بہت خوش شکل نوجوان تھے۔ انہوں نے پرکشش سرخ وردیاں پہن رکھی تھیں۔ چاروں طرف بہت سے انگریز اور میمیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ہمارے سرخ پوشوں کو دیکھا تو انہیں پر اشتیاق نگاہوں سے دیکھتے ہی رہ گئے۔ جب ہم نے کھانا کھالیا تو فیروز خان نون نے ہم سے شکوہ کیا کہ "آپ پٹھان لوگ کانگریس کے ساتھی ہو گئے ہیں اور ہمیں بڑا بھاری نقصان پہنچایا ہے"۔

میں نے ان سے کہا کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ہم تو پہلے آپ ہی کے پاس آئے تھے جب آپ نے ہمیں صاف جواب دے دیا تو اس کے بعد ہم کانگریس کے پاس گئے۔ ہم لوگ انگریزوں کی غلامی سے تنگ آ چکے ہیں اور آزادی کے خواہاں ہیں اور اگر آپ لوگ بھی آزادی کے طالب ہیں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

فیروز خان نے کہا بہت اچھا ہم آپس میں صلاح و مشورہ کر کے آپ کو اطلاع دے دیں گے لیکن فیروز خاں نون جب سے ایسے غائب ہوئے کہ پھر ۱۹۴۶ء میں پٹنہ کے مقام پر ہی دکھائی دیے یعنی بہار کے فسادات میں۔

خیر میں شملہ میں تھا۔ ہندوستان کے خارجہ محکمہ کے سیکرٹری ہاول صاحب نے مجھے خط لکھا کہ "اگر آپ مجھ سے ملنے کی تکلیف کر سکیں تو بہت مہربانی ہوگی"۔

میں نے جواباً لکھا "افسوس کہ میں آپ سے نہیں مل سکتا"۔

اس نے پھر گاندھی جی سے کہا اور گاندھی جی نے مجھ سے پوچھا کہ ہاول

صاحب کی ملاقات سے کیوں انکار کیا ہے؟ میں نے گاندھی جی سے کہا کہ میں ایک کمزور انسان ہوں پھسلن پر پاؤں نہیں رکھتا۔ ایسا نہ ہو کہ میں کہیں پھسل جاؤں۔

مہاتما جی بڑے ہنسے اور مجھے کہا ''کیا میں انگریزوں سے ملاقات اور گفت وشنید نہیں کرتا؟''

میں نے ان سے کہا ''آپ تو مہاتما ہیں''۔

قصہ کوتاہ مہاتما جی نے مجھے مجبور کر دیا اور ان کی دل جوئی کے لیے میں ہاول صاحب سے ملنے چلا گیا۔ ہاول صاحب ہمارے صوبہ سرحد میں رہ چکے تھے۔ وہ بڑے با اخلاق اور شریف انسان تھے۔ اور ویلی صاحب جو ڈپٹی فارن سیکرٹری تھے مجھ سے خوب واقف تھے۔ جب ہم لوگ باتیں کرنے بیٹھ گئے تو ہاول صاحب نے مجھ سے گلہ کیا اور کہا ''ہمارے اور پختونوں کے بہت اچھے تعلقات تھے لیکن پشتونوں میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کی شعلہ بار تقریروں کی وجہ سے ہمارے اور پٹھانوں کے تعلقات خراب ہو گئے''۔

میں نے ان سے کہا ''شعلہ بار تقریریں کسی کے تعلقات خراب نہیں کرتیں۔ آپ انہی ویلی صاحب سے دریافت کیجیے کہ آپ لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے؟'' اس کے ساتھ ہی ویلی صاحب سے میں نے کہا ''جوان! تم بات نہیں کرتے چپ کیوں ہو تمہیں تو سب کچھ معلوم ہے تم تو ان دنوں پشاور میں ڈپٹی کمشنر تھے اور ہمیں تو کانگریس سے تمہیں لوگوں نے ملایا ہے''

ہم نے ابھی باتیں ختم نہیں کی تھیں کہ ٹیلی فون آ گیا اور ہاول صاحب نے مجھے

بتایا کہ میں ہوم سیکرٹری ایمرسن صاحب کا ٹیلی فون ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ ان سے مل لیں۔

میں نے ہاول صاحب سے کہا کہ ''انہوں نے میرے ساتھ وقت مقرر نہیں کیا میں ان سے نہیں مل سکتا''۔

ہاول نے پھر انہیں ٹیلی فون کے ذریعے کہا ''مہربانی کر کے عبدالغفار سے کہیے کہ وہ ایک لمحے کے لیے آپ سے آ کر مل لیں۔

ہاول صاحب نے مجھے بتایا کہ اسی راستے میں ایمرسن صاحب کا دفتر ہے اچھا یہ ہوگا کہ چند ای ک منٹوں کے لیے ان سے ملتا جاؤں۔

میں ان (ہاول اور ویلی) سے رخصت ہوا اور راستے میں ایمرسن کے پاس چلا گیا۔ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ چھوٹتے ہی مجھ سے پر رعب دار انداز میں کہا۔ ''دیکھو تم نے میرٹھ میں تقریر کی اور اس میں تم نے کہا کہ فرنگی کا چہرہ تو سفید ہے لیکن اس کا دل کالا ہے اور اگر تمہاری یہ تقریریں آج لندن میں شائع کر دوں تو پھر امید نہیں ہے کہ انگریز تمہیں مراعات دے اور اصلاحات فراواں کرے''۔

میں نے اسے کہا ''میں نے صرف اتنی بات نہیں کی تھی اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ میری طرف سے آپ کو اجازت ہے کہ آپ میری وہ تمام تقاریر اخبارات میں شائع کر دیں۔ میں نے تو اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہمارے فرنگیوں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اور ہم تو ان پر عاشق تھے۔ جب ہم کہیں سے اچھی چیز حاصل کر لیتے

تھے تو اسے خود نہیں کھاتے تھے ۔ اپنی اولاد کو بھی نہیں کھلاتے تھے بلکہ اسے ان کے پاس لے جاتے تھے ۔ کہ وہ فرنگی یعنی انگریز ہم سے خوش ہو جائیں لیکن ہم ان کو خوش نہیں کر سکے اور وہ اصلاحات جو ہندوستان منظور نہیں کرتا تھا انہوں نے ہمیں وہ بھی فراواں نہیں کیں ۔ اسی لیے میں نے یہ کہا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چہرے تو سفید ہیں لیکن ان کے دل بڑے میلے ہیں''۔

ایمرسن صاحب کی باتیں ایسی نہیں تھیں جیسی کہ ہاول صاحب کی تھیں کیونکہ ایمرسن کی ساری عمر پنجاب میں گزری تھی۔

شملہ میں ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' اخبار کا ایک نامہ نگار تھا۔ اور اس کا ایک ساتھی تھا وہ میرے پاس اکثر آتے جاتے تھے ۔ میری اور وائسرائے کی ملاقات کے بارے میں انہوں نے بڑی غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں اور نامہ نگار نے ایک غلط خبر اپنے اخبار میں شائع کی تھی کہ ''سرحد کی تحقیقات کے بارے میں ورکنگ کمیٹی نے عبدالغفار خاں کی باتیں نہیں مانی ہیں اس لیے عبدالغفار خاں استعفیٰ دے دیں گے''۔ اس خبر نے پنجاب اور صوبہ سرحد میں ایک بہت بڑا ہنگامہ بپا کیا تھا۔ میں جب لاہور میں پہنچا تو سر صاحبزادہ عبدالقیوم کا ایک آدمی میرے پاس آیا یہ آدمی خاص طور پر صوبہ سرحد سے میرے پاس آیا تھا اور اس نے مجھے کہا کہ ''مجھے صاحبزادہ صاحب نے خاص طور پر آپ کے پاس بھیجا ہے اور آپ نے انہوں نے کہا ہے کہ خدا کے واسطے کہیں کانگریس کو نہ چھوڑ یے گا۔ اور اگر آپ کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تو پھر انگریز ہمیں کچھ بھی نہ دیں گے''۔

سر ریلف گرفتھ سے ملاقات

میں شملہ سے واپس آیا تو ہمارے بعض ساتھیوں کے دلوں میں انگریزوں نے خوف اور خفگی پیدا کر رکھی تھی اور انہوں نے چھپ چھپ کر میری مخالفت شروع کر دی تھی۔ ہمارے بعض ساتھی یہ بات تحریک کے لیے اچھی نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہماری اصلاح کے لیے کوشش کی اور ایسے ساتھیوں میں ہمیں میاں جعفر شاہ کے ہاں اکٹھا کیا اور بہت سی باتوں کے علاوہ میرے مخالفین یہ بات بھی کہتے تھے ''ہمارا ہندوؤں پر بھروسہ اور اعتماد نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ہماری حق تلفی کر دیں۔ ہمیں اس بارے میں ایک ایسی قرارداد منظور کرنی چاہیے''۔

میں نے انہیں کہا ''ابھی تک ہمارے ساتھ انہوں نے کوئی بے اعتباری کی بات نہیں کی ہے۔ ایسے وقت میں ہم اس قسم کے مسئلے ہمیں نہیں چھیڑنے چاہئیں۔ اور اگر انہوں نے ہمارے ساتھ کوئی ایسا کام کیا تو پھر کسی نے باندھ تو نہیں رکھا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر انہوں نے کبھی ایسا کوئی کام کیا تو آپ سب سے آگے ہو جاتا اور ہم سب خدائی خدمت گار آپ کے پیچھے چل پڑیں گے'' قصہ کوتاہ یہ کہ ہمارے تمام اختلافات کا فیصلہ ہو گیا۔

سر ریلیف گرفتھ ان دنوں صوبہ سرحد کے چیف کمشنر تھے۔ وہ صوبے میں ایک دربار منعقد کرنا چاہتے تھے۔ سر گرفتھ نے مجھے بھی شمولیت کی دعوت دی۔ لیکن میں

نے وہ نامنظور کر دی۔ اس کے بعد انہوں نے میرے لیے ایک اور حکم بھیج دیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں لیکن میں نے یہ حکم بھی نہ مانا۔ اور ان سے ملاقات کرنے کو نہیں گیا۔ اس پر وہ مجبور ہو گئے اور انہوں نے میرے پیچھے پولیس کو بھیج دیا۔ چنانچہ پولیس مجھے چیف کمشنر کے پاس لے گئی ان سے ملاقات کے دوران ان خطرات کا ذکر آیا جو بقول چیف کمشنر گرفتھ ملک کو پیش تھے چیف کمشنر نے کہا ''ہمیں تین خطرات کا سامنا ہے۔ ایک قبائل دوسرا افغانستان اور تیسرا روس''۔

میں نے ان سے کہا کہ ''اگر آپ لوگوں کو واقعی قبائل سے خطرہ ہے اور چاہتے ہیں کہ ان کی اصلاح ہو تو ہم حاضر ہیں آپ سے تعاون اور امداد کریں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ لوگ اپنی موجودہ قبائل پالیسی ترک کر دیں اور انہیں دشمن کی نگاہ سے نہیں بلکہ دوست کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیں اور ایک ایسے پروگرام کو قبائلیوں میں ہماری مدد اور تعاون سے عملی شکل دیں کہ جس سے قبائلیوں کو فائدہ پہنچے''۔

گرفتھ صاحب نے پنسل اور کاغذ لے لیا۔ نوٹ لینے شروع کیے اور میں جو کچھ بھی کہتا تھا وہ اسے لکھتے جاتے تھے۔ میں نے ان سے کہا ''آپ لوگ قبائلیوں کی تباہی اور قتل مقاتلے پر جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس سے آدھے ان کے لیے گھریلو صنعتیں قائم کر دینا چاہئیں تا کہ وہ اپنے لیے آزاد اور باعزت روزی کما سکیں اور وہ صنعت و حرفت اور تجارت سے آشنا ہو جائیں اور قبائلیوں میں ان کے بچوں کی تعلیم کے لیے مدرسے قائم کر دیے جائیں تا کہ ان کی اولاد نئی زندگی کی اہلیت اور قابلیت کے اندر پیدا کر لے۔ ان کے لیے ہسپتال بھی بنا دیے جانے چاہئیں تا کہ ان کا

علاج معالجہ ہو سکے۔ اسی طرح یہ غیرت مند پٹھان پشتون قوم کے کارآمد افراد مفید شہری بن جائیں گے"۔

افغانستان کے خطرے کے بارے میں گرفتھ صاحب نے مجھ سے کہا "افغانستان سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں کیونکہ ایک تو افغانستان کی حکومتیں ہمیشہ آپ کی دوست ہوتی ہیں حتیٰ کہ جو حکومت آپ کو ناپسند ہوتی ہے وہ حکومت قائم ہی نہیں رہ سکتی اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم پٹھان آپ کے دوست ہیں۔ وہ بھی آخر ہمارے بھائی اور عزیز ہیں۔ وہ بھی خواہ مخواہ آپ کے دوست بن رہیں گے۔ رہ گیا روس سے خطرے کا سوال...... اس خطرے کے مقابلے کا بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ ہمیں ہمارا حق دیا جائے تا کہ یہ **ملک** ہمارا ہو جائے۔ تو ہم ایک بڑی قوم ہیں جو دریائے آمو سے لے کر آدھے پنجاب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔ اور اگر کسی کے سینگ میں خواہ مخواہ خارش ہونے لگے تو ہم اس کی خارش کا علاج کرتے ہوئے اپنے **ملک** کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے۔

گرفتھ صاحب نے یہ سب باتیں لکھ لیں اور مجھے کہہ دیا "میں دہلی جا رہا ہوں تا کہ وائسرائے سے یہ باتیں کروں" گرفتھ صاحب کی شکل وصورت اور پیشانی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہماری باتوں سے متفق ہیں گرفتھ صاحب نے مجھ سے کہا "اچھا پھر بھی تو کبھی کبھی مجھ سے ملا کرو گے؟"

میں ان کے سامنے ہنس پڑا اور کہا "ہاں لیکن طریقے سے جیسے کہ آج آپ نے میرے ساتھ برتا ہے۔ یعنی پولیس کے ذریعے"۔

انہوں نے کہا ''دیکھو یہ اتنے لوگ میری ملاقات کے لیے آرزومند ہیں اور کئی دنوں سے انتظار کر رہے ہیں اور ان میں ذرا باہر بیٹھے ہوئے خان بہادروں اور خواتین کو تو دیکھو جواب بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن میں ان سے نہیں ملتا ہوں اور تمہاری منت سماجت کرتا ہوں مگر تم مجھے نہیں ملتے''۔

میں نے ان سے ہنس کر کہا ''گرفتھ صاحب یہ لوگ شخصی فائدے کے لیے آپ کا طواف کرتے ہیں۔ میں آپ لوگوں سے کوئی شخصی خواہش نہیں رکھتا کہ ایسی خوشامدیں کر کے اپنے آپ کو تھکاؤں''۔

گرفتھ صاحب نے میز پر مکہ مار کر کہا ''ایک بدقسمت حکومت جو دیانت دار لوگوں کو اپنے سے دور رکھتی ہے اور بددیانت لوگوں میں گھری رہتی ہے۔ اس کا اس کے سوائے اور کیا انجام ہوگا کہ وہ فنا ہو جائے گی۔ خدا انگریزی حکومت کی مدد کرے''۔

میں گرفتھ صاحب سے رخصت ہوا اور وہ وائسرائے ہند سے ملنے دہلی چلے گئے۔

میں اس امید میں تھا کہ اگر خدا کو منظور ہوا تو میرے اور ملک کے لیے کچھ ہو جائے گا۔ لیکن کچھ دن بعد گرفتھ صاحب جب وائسرائے سے ملاقات کر کے واپس آ گئے تو انہوں نے سب سے پہلے مجھ پر ہاتھ صاف کیا اور ۲۴ دسمبر ۱۹۳۱ء کو مجھے گرفتار کر لیا۔ ہندوستان میں پھر سب سے پہلے مجھے ہی گرفتار کیا گیا۔ حالانکہ ابھی ک گاندھی جی لندن کی گول میز کانفرنس سے بھی واپس نہیں آئے تھے۔ ہندوستان میں اندھا دھند مار پیٹ شروع ہو گئی اور میرے بعد ہزاروں کی تعداد میں پٹھانوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

عدم تشدد تحریک ...... پٹھانوں میں مقبولیت

ہمارے ملک میں آزادی کی دو قسم کی تحریکیں شروع ہوئی تھیں ۔ایک پر تشدد اور دوسری عدم تشدد پر مبنی تھی ۔تشدد کی تحریک پہلے شروع ہوئی تھی ۔اور اس کے چالیس پچاس سال بعد ۱۹۲۹ء میں عدم تشدد کی تحریک شروع ہوئی تھی ۔ تشدد کی تحریک کو انگریزوں نے تشدد کے ساتھ دبا دیا تھا لیکن عدم تشدد پر مبنی تحریک کو نا قابل بیان مظالم اور قید و بند کے باوجود انگریز نہ دبا سکے' تشدد کی تحریک نے لوگوں میں خطرہ اور بزدلی پیدا کر دی تھی اور لوگوں کو بے جرات اور اخلاقاً کمزور بنا دیا تھا۔لیکن عدم تشدد کی تحریک نے پٹھانوں کے دلوں سے خطرہ نکال باہر پھینکا اور ان میں بہادری پیدا کر دی۔اس تحریک نے لوگوں کا اخلاق بلند کر دیا اور ان میں جرات پیدا کر دی۔ تشدد کی تحریک نے لوگوں کے ددلوں میں اس تحریک سے نفرت پیدا کر دی۔اور عدم تشدد کی تحریک نے لوگوں میں باہمی پیار اور محبت پیدا کر دی ۔ پٹھانوں میں قومیت اور بھائی چارے کی ایک نئی زندگی پیدا کر دی اور ان کی شاعری ان کے ادب ان کے تمدن اور ان کی معاشرت میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔حقیقت یہ ہے کہ

''تشدد نفرت ہے اور عدم تشدد محبت ہے''

اس نفرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک آدمی کسی انگریز کو ہلاک کر دیا کرتا تھا مگر اس قتل کی سزا انگریز صرف اسی آدمی قاتل کو نہیں دیتے تھے بلکہ اس سے متعلقہ گاؤں اور سارے علاقے کو اجتماعی جرمانہ اور قید کی سزا دیا کرتے تھے لوگوں کی نگاہ میں اس

تمام ظلم اور زیادتی کا سبب وہ آدمی انگریز کا قاتل اور اس کی پر تشدد تحریک تھی اس وجہ سے لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ان کی یہ سب مصیبتیں اس آدمی اور اسی تحریک کی وجہ سے ہیں لیکن ہماری عدم تشدد پر مبنی تحریک میں تو ہر آدمی تکلیف کا خیر مقدم کرتا تھا۔ اس سے قوم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا فائدہ ضرور ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں میں اس تحری کے تئیں ہمدردی اور محبت پیدا ہوگئی تھی۔ لہٰذا تشدد کی تحریک اپنے مقصد میں ناکام ہوگئی اور یہ عدم تشدد کی تحریک اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے ملک کو آزاد کرالیا اور انگریزوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔

خدائی خدمت گار تحریک صرف سیاسی تحریک نہیں ہے۔ یہ تحریک پٹھانوں کی سیاسی، مجلسی، اقتصادی اور روحانی تحریک ہے اسی تحریک کی بدولت پٹھانوں میں پریم 'پیار محبت بھائی چارہ' یگانگت اور قوم پروری کا احساس اور خدمت کے جذبات پیدا ہوئے ہیں اس تحریک نے پٹھان قوم کو دوسرا بڑا فائدہ یہ پہنچایا ہے کہ چونکہ پشتون کا تمام تر تشدد اپنے بھائی کے خلاف تھا اور تشدد کے ہاتھوں ان کا گھر برباد تھا۔ عدم تشدد نے اسے آباد و شاداب بنا دیا۔ انگریز کہا کرتے تھے کہ عدم تشدد پر کاربند پٹھان تشدد کے دیوانے پٹھانوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۲ء میں انگریزوں نے ہم پر بے شمار مظالم کیے اور جبر و استبداد اور قیدیوں کے علاوہ ایسے شرمناک کام بھی اس غرض سے کیے کہ پٹھان لوگ تشدد پر آمادہ ہوجائیں لیکن انہیں اس کمینہ مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس ظلم اور ناروا سلوک کی چند مثالیں بیان کردینا بے جا نہ ہوگا۔

انگریزوں نے پٹھانوں کی شلواریں اتاریں۔ پٹھانوں کو ننگا کیا۔ چارسدہ کی پکٹنگ میں تو انہوں نے خدائی خدمت گاروں کے تمام کپڑے اتار لیے اور ان کے خایوں یعنی فوطوں میں پھندے ڈالے گئے۔ پھندوں اور رسیوں کے ذریعے خدائی خدمت گاروں کے خایوں کو کھینچا جاتا تھا۔ جب وہ بیہوش ہو جاتے تھے تو انہیں ٹٹی پیشاب سے بھرے ناند میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اور اس میں انہیں غوطے دیے جاتے تھے۔ ی تو میں نے بطور مچال آپ کے سامنے صرف چارسدہ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ اسی طرح کے انتہائی شرمناک ناقابل بیان مظالم ہمارے صوبے میں انگریز نے روا رکھے تھے۔ کوہاٹ میں ہمارے خدائی خدمت گاروں کو سرکاری آدمی پکڑ لیتے تھے اور انہیں پوس ماگھ کے مہینوں میں ہڈیوں کو کڑکڑا دینے والی سردی میں ٹھنڈے پانی میں غوطے دیتے تھے۔ گولیوں سے خدائی خدمت گاروں کا سر اڑا دینا تو سرکار کا ایک شغل تھا۔ خدائی خدمت گار تحریک کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ صرف ہری پور کے ایک ہی جیل خانے میں دس بارہ ہزار خدائی خدمت گار قیدی تھے۔ اور اتنی سخت سردی مٰں ان قیدیوں کو صرف ایک کمبل اور ایک ایک چپاتی دی جاتی تھی وہ بھی کسی کو ملتی تھی اور کسی کو نہیں ملتی تھی۔ بہت معزز اور تعلیم یافتہ قیدیوں کو بیدوں سے پیٹا گیا۔ ان سے چکیاں پسوائی گئی۔ درگھائیوں میں باندھا گیا یعنی ان سے کولھو چلوائے گئے اور انہیں قید تنہائی کی کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا۔ قصہ کوتاہ یہ ہے کہ ایسا کوئی ظلم نہیں تھا جو ان غریبوں پر نہ توڑا گیا ہو۔

☆☆☆

تین سال ہزاری باغ جیل میں

۲۴ دسمبر ۱۹۳۱ء کو میں ڈاکٹر خان صاحب کے بنگلے میں تھا۔ بہت زیادہ کام کرنے کی وجہ سے میں بیمار ہو گیا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا کہ پولیس نے مجھے آن کر گرفتار کرلیا اور میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو بھی پکڑلیا۔ ہمیں موٹر میں بٹھایا گیا اور اٹک کے پل پر پہنچا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد قاضی عطاء اللہ خان اور سعد اللہ کو بھی گرفتار کر کے وہاں لے آئے۔ سعد اللہ ڈاکٹر خان کا بڑا فرزند تھا اور انجینئر تھا اور ابھی ابھی انگلینڈ سے آیا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک ٹرین کھڑی تھی۔ ہم سب کو اس میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی روانہ ہوئی۔ ہمارے ساتھ ایک سردار خیل کابلی انسپکٹر پولیس تھا۔ وہ قاضی صاحب کا بھی واقف تھا۔ انسپکٹر صاحب نے بتایا کہ انہیں ڈاکٹر صاحب نے موت کے منہ سے بچایا تھا۔ دوسرا ہمارے ساتھ ایک پنجابی انسپکٹر تھا۔

میرا تو ہمیشہ یہ قاعدہ رہا ہے کہ جب میں گرفتار کرلیا جاتا ہوں اور جو پولیس میرے ساتھ ہوتی ہے میں ان سے کوئی بات نہیں پوچھتا اور نہ ہی ان سے کچھ مانگتا ہوں۔ قاضی صاحب نے اس پشتون افسر سے اخبار مانگ لیا۔ لیکن وہ اسے ڈر کے مارے کب دیتا تھا۔ پنجابی کا یہ کام تھا کہ جب ہم ڈبے کی کھڑکی کھول لیتے تھے تو یہ فوراً اسے بند کر دیتا تھا۔ تاکہ ہمیں کوئی دیکھ نہ لے۔ آخر میں نے اس سے کہا کہ ''ارے لڑکے ہم عورتیں تو نہیں ہیں کہ تم یہ کھڑکیاں بند کرتے ہو اور تمہاری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہمیں کوئی دیکھ نہ لے'' لیکن وہ بڑا بے شرم تھا۔

جب ہمارا ڈبہ یوپی اتر پردیش پہنچ گیا تو یہاں سرحدی پولیس سے ہمارا چارج لینے کے لیے ایک انگریز افسر ہمراہ ایک گورا سارجنٹ آیا ہوا تھا۔ وہ انگریز میرے پاس آیا اس نے میرے ڈبے کا دروازہ کھول دیا اور مجھ سے کہا "آؤ باہر اسٹیشن پر اپنے پاؤں آزاد کرنے کے لیے ٹہلو"۔

اب اس انگریز اور ان مسلمان افسروں کے رویے میں فرق کا اندازہ کیجیے۔ حالانکہ اول الذکر انگریزوں سے ہماری جنگ تھی ان سے ہم حکومت لے رہے تھے اور وہ حکومت انہی اپنے بھائیوں کے لیے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میں ڈبے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے اثنا میں وہی انگریز آیا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا اور اس میں شراب تھی۔ اس نے بڑے پیار و محبت سے مجھے پیش کی اور کہا کہ اسے پی لو میں نے جواب دیا کہ میں شراب نہیں پیتا۔ یہ بات سن کر وہ بڑا حیران ہوا۔ میں اس کی یہ رواداری اور پریم کبھی نہیں بھلا سکا۔

جب ہم الہ آباد پہنچے تو یہاں ڈاکٹر خان صاحب کو اتارا گیا اور انہیں نینی جیل میں بھیج دیا گیا۔ جب گاڑی تھوڑا آگے بڑھی اور سعد اللہ خاں کو ہم سے علیحدہ کر لیا گیا اور اسے بنارس جیل پہنچا دیا گیا۔ پھر بہار کا صوبہ شروع ہو گیا اور بہار میں قاضی عطاء اللہ کو ہم سے علیحدہ کر لیا گیا اور انہیں گیا کے جیل لے جایا گیا۔ اور مجھے ہزاری باغ جیل خانے میں لے جایا گیا۔ ہزاری باغ جیل سٹیشن سے چالیس میل دور ہے اور مجھے جب موٹر میں بٹھایا گیا تو میرے ساتھ پشاور کا سردار خیل انسپکٹر اور دو انگریز افسر بھی بیٹھ گئے اور ایک ڈپٹی کمشنر تھا اور دوسرا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ ہمارے بیٹھتے

ہی انہوں نے مجھے انگریزی کا ایک اخبار پڑھنے کو دیا۔ وہی اخبار جو ہمارا سردار خیل انسپکٹر اپنے دوست اور محسن کو نہیں دیتا تھا۔ جس نے اس کے اپنے قول کے مطابق اسے مردہ سے زندہ کر دیا تھا۔

جب میں جیل خانے میں داخل ہوا تو جیل خانے کے افسر نے جو ہندو تھا میرے پاس آ کر مجھ سے پوچھا۔ ''یہ پولیس افسر سردار خیل کون ہے اور کس جگہ کا رہنے والا ہے؟''

میں نے ان سے پوچھا'' آپ کیوں یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں؟''

انہوں نے مجھے بتایا کہ ''یہ تو ایک بہت رزیل انسان ہے۔ مجھے کہتا تھا کہ اس آدمی کا خوب خیال رکھنا۔ یہ بہت خطرناک آدمی ہے''۔

مجھے ایک بارک میں تن تنہا بند کر دیا گیا۔ اور بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب کے بغیر اور کسی کو میرے پاس آنے یا مجھے ملنے کی اجازت نہیں تھی میں شاہی قیدی تھا۔

کلکٹر ہر مہینے میرے پاس آتا تھا۔ میں ہمیشہ تنہائی میں بیمار پڑ جاتا ہوں آہستہ آہستہ میری صحت گرنے لگی۔ وہ کلکٹر بڑا اچھا آدمی تھا۔ اس نے حکومت کو لکھا کہ میرا جو ساتھی ہے اسے میرے ساتھ بھیج دیا جائے۔ قاضی صاحب گیا میں تھے۔ وہ بھی تنہائی میں تھے اور مجھے تو پھر بھی تھوڑی بہت نیند آ جاتی تھی۔ لیکن اس بے چارے کو تو بالکل نیند نہیں آتی تھی۔ میری طرح وہ بھی حکومت کی آنکھوں میں کانٹا تھے۔ کلکٹر کی اس سفارش کی حکومت نے مخالفت کی اور ان کی بجائے حکومت نے

میرے پاس ڈاکٹر خان صاحب کو بھیج دیا۔ جب ڈاکٹر صاحب آ گئے اور انہوں نے یہ دیکھا کہ مجھے تو ہمیشہ بارک میں بند رکھا جاتا ہے اور وہ نینی جیل میں باہر پھرا کرتے تھے۔

ہزاری باغ کے اس جیل کا سپرنٹنڈنٹ ایک پنجابی تھا اور وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جنگ یورپ میں کہیں ایک جگہ رہا تھا۔ مگر بڑا بزدل تھا۔ ڈاکٹر صاحب جب کبھی باہر ٹہلنے کی بات کرتے تو وہ کہا کرتا ''بھائی میں مارا جاؤں گا'' لیکن ڈاکٹر صاحب اس بات پر اڑے ہوئے تھے اس نے ہمیں جنگلے کے باہر سے چلے جانے کی اجازت ہی دے دی۔ اس کے بعد جب ہمیں پتہ لگ گیا کہ اس جیل خانے میں تو راجندر پرشاد' آچاریا کرپلانی اور بہار کے دیگر بہت سے قیدی ہیں تو ہم کبھی کبھی ان سے ملنے لگے۔

بہار کے لوگ بہت اچھے اور شریک انسان ہیں۔ جب ہمیں اجازت مل گی تو ہم کبھی کبھار جیل خانے میں گھوما پھرا کرتے تھے اور ان دوسرے قیدیوں سے بھی ملتے تھے اور ہمارے ان سے اچھے تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے۔ ہمارے جیل خانے کا افسر جسے چھوٹا صاحب کہتے تھے بڑا اچھا آدمی تھا اور قوم پرستوں سے بڑی ہمدردی رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہم نے یہ طے کر لیا کہ جو بھی سیاسی قیدی رہا ہوتا تھا اسے ہم چائے پارٹی دیا کرتے تھے۔ لیکن ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کی چھوت چھات میں بڑی کمی آ گئی تھی۔ اور ان کی بہت سی اصلاح ہو گئی تھی۔

ایک دن ایک شخص کو چائے پارٹی پر ہم نے اپنا مہمان بنایا۔ جب چائے آ گئی تو

چائے کے ساتھ پکوڑے اور تلے ہوئے بینگن بھی تھے۔ میں مہمان کے لیے پیالی میں چائے ڈالتا تھا اور پیالی اس کے ہاتھ میں پکڑواتا تھا اور پھر میں پکوڑے اٹھاتا تھا اور اسے دے دیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بینگن اٹھا کر اسے دیتے تھے۔ وہ چائے پیتا تھا اور پکوڑے کھاتا تھا۔ جب چائے ختم ہوگئی تو وہ ہنسنے لگا۔ جب اس سے دریافت کیا کہ یہ ہنسی اسے کس بات پر آئی ہے تو اس نے کہا کہ ہم میں اتنی چھوت چھات تھی کہ ایک دن ایک مسلمان پوسٹ مین آیا تھا اس نے مجھے میرا ایک پوسٹ کارڈ دیا تھا۔ پوسٹ مین سے کارڈ لیتے وقت میں نے اس کارڈ کو اپنی انگلیوں میں ایک کونے سے پکڑا۔ دوسرا کونا مسلمان پوسٹ مین کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت میرا بھائی پاس کھڑا تھا۔ اس نے مجھ پر پانی ڈالا اور کہا کہ تو بھرشٹ ناپاک ہوگیا ہے۔

بہار کے رہنماؤں سے مجھے محبت تھی۔ میں ان کی وہ محبت اپنے دل سے نہیں نکال سکتا بہار کے عورت مرد دونوں بڑے بہادر ہیں۔ اورانہوں نے ملک کی آزادی کے لیے بڑی قربانیاں کی ہس مردوں کو تو چھوڑ دیجیے۔ میں آپ کو ایک عورت کی کہانی سناتا ہوں۔ یہ خاتون ہمارے ساتھ جیل خانے میں قید تھی۔ ایک دن چھوٹا صاحب آیا اور اسنے مجھے عورت کا قصہ سنایا ان نے مجھے بتایا کہ آج اجیل خانے میں ایک عورت کا خاوند جو وکیل ہے اس سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ اس کے ہمراہ پانچ بچے بھی تھے۔ ملاقات کے دوران اس نے اپنی عورت کی بڑی منت ساجت کی کہ یہ جو دو چھوٹے بچے ہیں یہ وہ لے لے اور یہ تین اس کے آس پاس رہیں۔ یعنی دو وہ عورت اور بڑے تین بچے اپنے پاس رکھے گا۔

عورت نے خاوند کو جواب دیا ''سب بچے تم ہی رکھو۔ میں تو انہیں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی تھی تو م ہی نے میری بات نہیں مانی تھی ۔اب میں انہیں نہیں رکھوں گی''۔

چھوٹے صاحب نے کہا ''میں نے اس عورت سے پوچھا کہ ان بچوں کو تم کیوں نہیں رکھتیں؟''اس نے جواب دیا ''جب کانگریس نے جنگ کا بگل بجایا تھا تو میں نے اپنے خاوند سے کہا تھا کہ یہ ملک وقوم کی جنگ ہے لوگ جا رہے ہیں تم بھی جاؤ۔لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اس نے یا ک دو مقدمے عدالت میں دائر کر رکھے ہیں۔وہ مقدمے جب ختم کر لے گا تو وہ اس جنگ میں حصہ لے گا۔ کچھ دن کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ مقدمے ختم ہو گئے ہیں یا ابھی باقی ہیں ۔اس نے جواب دیا تھا کہ نہیں تھوڑے سے رہ گئے ہیں۔ کچھ دن کے بعد پھر میں نے اس سے پوچھا تو اسنے مجھے جواب کچھ گول مول سا جواب دیا تب میں سمجھ گئی کہ یہ جیل جانے کے لیے تیار نہیں ہے ۔تو میں خود چلی گئی۔ پکٹنگ پر کھڑی ہوگئی مجھے گرفتار کر کے اس جیل میں قید کر دیا گیا''۔

اس جیل خانے میں راجندر بابو اور ان کی ہمشیرہ بھی قید تھیں ۔اس طرح سے بہت سی عورتیں اور مرد اسی جیل خانے میں ہمارے ساتھ قید تھے جس قوم کی عورتیں اور مرد اپنے ملک کی آزادی کے لیے کمر کس لیتے ہیں وہی اپنی منزل مقصود پر پہنچتی ہے۔یہی وجہ تھی کہ انگریز مجبور ہو گئے کہ وہ چلے جائیں ۔لہذا انہوں نے ہمارا ملک ہمارے حوالے کر دیا۔

رہائی کے بعد کلکتہ آمد

تین سال بعد جب ہم ہزاری باغ جیل سے رہا ہوئے وہم اس عورت کے مہمان بنے۔ میں شاہی قید میں تھا۔ میرے بچوں کو الاؤنس نہیں دیا جاتا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر خان صاحب اور قاضی صاحب کے بچوں اور ان کے گھر کے دوسرے آدمیوں کو الاؤنس دیا جاتا تھا۔ اور سعد اللہ خان کی ماں کو بھی الاؤنس ملتا تھا۔ لیکن میرے بچوں کو نہیں دیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غنی پیسوں کی کمی کی وجہ سے امریکہ سے واپس آ گیا اور اپنی تعلیم کو تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ میری اپنی جائیداد بھی بہت تھی۔ کیونکہ ہم سب تو قید ہو گئے تھے۔ ہمارا کوی رہا نہیں تھا اور حکومت کے اشارے پر ہمارے کاشتکاروں یعنی زرعی مزدوروں نے ہمارا مال خرد برد کر دیا تھا۔ تقریباً تین سال کے بعد ہمیں رہا کیا گیا لیکن سوبہ سرحد اور پنجاب میں ہمارا داخل بند کر دیا گیا۔ ہمیں کہہ دیا گیا کہ ہم لوگ ہندوستان بھر میں چل پھر سکتے ہیں لیکن پنجاب اور سرحد میں نہیں جا سکتے۔

بہار میں ہمارے بہت سے سیاسی قیدی دوست بن گئے تھے۔ ہم ہزاری باغ سے پٹنہ چلے گئے۔ راجندر پرشاد اور دوسرے دوستوں سے ملنے کے بعد ہم واردھا گئے واردھا میں گاندھی جی ٹھرے انہوں نے سیٹھ جمنا لال جی بجاج دونوں نے ہمیں وہاں آنے اور رہنے کی دعوت دی تھی۔ ہم وہاں چلے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں بمبئی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس تھا۔ ہمارے واردھا پہنچنے کی اطلاع جب کانگریسی

حلقوں میں پہنچ گئی تو استقبالیہ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ باچا خان کو اس کانگریس کا صدر بنایا جائے اور راجندر پرشاد نے مجھے تار بھی دے گیا کہ مجھے صدارت کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے اور وہ استعفیٰ دیتے ہیں اور مجھے اپنی جگہ صدر مقرر کرتے ہیں لیکن میں نے یہ بات منظور نہ کی اور تار کے ذریعے انہیں اطلاع دے دی کہ ''میں ایک سپاہی ہوں خدائی خدمت گار ہوں۔ میں خدائی خدمت گاری کروں گا'' کچھ دنوں کے بعد ہم واردھا سے کلکتہ چلے گئے۔ وہاں کی کارپوریشن نے ہمیں استقبالیہ ایڈریس پیش کیا۔ میرا یہ خیال تھا کہ اس صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے اور سیاسی طور پر وہ پسماندہ ہیں لہذا میں ان کی خدمت کروں گا۔ میں نے کلکتہ میں مختلف جگہوں پر چند تقریریں کیں اور مسلمانوں رپ یہ بات واضح ی کہ میں یہاں تمہاری خدمت کے لیے آیا ہوں۔ میں دیہات میں کام کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مصیبت بہار میں ہوا کرتی ہے سہروردی بھی اسی مجلس کے ممبر تھے اور انہیں کے قماش کے دیگر مسلمان بھی اس میں تھے۔ ان لوگوں نے میری امداد تو درکنار الٹی سرتوڑ کوششیں کی کہ میں دیہات میں نہ جاسکوں کیونکہ اس سے ان کی لیڈری میں فرق پڑتا تھا۔ جب میں ان مسلمانوں سے بالکل مایوس ہوگیا تو پروفیسر پھل گھوش جو میرے دوست تھے اور ورکنگ کمیٹی ک ممبر بھی تھے مجھ سے کہا کہ وہ میرے ساتھ دیہات میں جائیں گے اور کہ یہ مسلمان تو مردہ ہیں۔ مجھے بنگال کے آدمی کی ضرورت تھی کہ دیہات کے لوگ سوائے بنگالی زبان کے دوسری زبان کو نہیں سمجھتے تھے۔ اور میں بنگالی نہیں جانتا تھا۔

پرپ چھل بابو اور میں دیہات کے دورے پر چل پڑے۔ ہم جس گاؤں میں بھی جاتے وہاں میں اپنے طریقے سے کام شروع کر دیتا۔ میں لوگوں سے ملتا' ان سے بات چیت کرتا' انہیں میں یہ سمجھاتا کہ ہندوستان سونے کا دیش ہے۔ ہر گھر میں دودھ اور گھی کی افراط تھی۔ چاول عام تھے۔ لیک اب یہ کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے بچے بھوکے پیاسے ننگے بدحال اور خوار وزار ہیں وہ غریب میری باتیں بڑے غور وخوص سے سنتے تھے۔ آخر میں ہم انہیں یہ کہا کرتے تھے کہ جب تک یہ ملک آزاد نہیں ہوتا اور اس ملک کی باگ ڈور تمہارے ہاتھوں میں نہیں آتی تب تک تم اور تمہارے بچے پیٹ بھر کر کبھی نہیں کھا سکیں گے۔

اس طرح جب ہم نے کچھ دن لوگوں میں گھوم پھر لیا تو ہم نے ایک جگہ جلسہ منعقد کر دیا۔ ہمارے اس پہلے جلسے میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہوئے تھے کچھ دنوں کے بعد جب ہم نے دوسرا جلسہ کیا تو اس میں دو سو لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور اس طرح بتدریج جلسوں میں لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ اس اثناء میں بمبئی کانگریس کا وقت قریب آ گیا اور ہم بمبئی چلے گئے۔ جانے سے پہلے میں نے پرچھل بابو سے کہہ دیا کہ یہ لوگ مردے نہیں ہیں۔ مگر انہیں زندہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

☆☆☆

ایک بار پھر قید تنہائی

بمبئی کے کانگریس کے اجلاس میں وہاں کی کرسچین سوسائٹی کے چند آدمی میرے پاس کانگریس پنڈال میں آئے اور مجھے دعوت دی کہ میں ان کی سوسائٹی میں گیا۔انہوں نے مجھ سے خدائی خدمت گاری کے بارے میں پوچھا۔میں نے ان سے خدائی خدمت گاری کا سارا قصہ بیان کیااور ہمارے ساتھ جو بیتی تھی وہ بھی میں نے انہیں سب سنادی۔مجھے اس وقت تک یہ معلوم نہیں تھا کہ سچ بولنا بھی انگریزوں کے قانون جرم میں ہے۔جب کانگریس کا اجلاس ختم ہو گیااور ہم واپس چلے گئے اور بنگال جانے کا پروگرام بنالیا اور یہ بھی فیصلہ کرلیا کہ وہاں میں اتنے دن کام کرتا رہوں گا جب تک مجھے اپنے صوبے میں جانے کی اجازت نہیں مل جاتی۔

میرے اس ارادے کا پتہ جب حکومت کو لگ گیا تو اس کے من چھنا کہ بیتا کہ بنگال کے ہندو تو پہلے ہی سے بیدار ہیں اور اگر یہ مسلمان بھی جاگ پڑے تو وہ ان کی چوری نہیں کر سکے گی اور اس کی خیر بھی نہیں ہوگی۔پھر کیا تھا۔پولیس آ گئی۔مجھے گرفتار کرلیا گیا۔میں نے بمبئی میں جو تقریر کی تھی اس کی پاداش میں مجھے دو سال کی قید سخت کی سزا ہو گئی۔پہلے مجھے بمبئی کے جیل خانے میں بند کیا گیا پھر وہاں سے سابرمتی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔اس جگہ کا ایک انگریز سپر نٹنڈنٹ بڑا سخت مزاج تھا۔مجھے اس نے اکیلے ایک وارڈ میں بند کر دیا۔اس وارڈ میں نمبر دار کو آنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔وہ وارڈ کا دروازہ باہر سے بند کر کے تالا لگا دیا تھا۔اور باہر بھی بیٹھا

رہتا تھا۔ اس جگہ کی خوراک اور ہماری خوراک میں بڑا فرق تھا۔ مجھے بی کلاس دی گئی تھی لیکن اس صوبے کی بی کلاس اور ہمارے یہاں کی سی کلاس میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہاں بی کلاس کے لیے چارپائی نہیں تھی۔ میں فرش پر سویا کرتا تھا میرے ساتھ کوئی بات کرنے والا نہیں تھا۔ یہاں بندر بہت تھے۔ میں انہی بندروں سے کھیلا کرتا تھا۔ جب میں سخت بیمار پڑ گیا تو مجھے انفلوئنزا ہو گیا۔ لیکن باوجود اتنی سخت بیماری کے مجھے ہسپتال نہیں لے جایا گیا۔ یہاں تک کہ وارڈ میں مجھے چارپائی بھی نہ دی گئی۔ میں سیمنٹ کے فرش پر پڑا رہتا تھا لیکن خدا نے اپنی مہربانی سے مجھے صحت یاب کر دیا۔

کچھ مدت کے بعد صوفیہ میری ملاقات کے لیے آئی۔ اس کے بعد گاندھی جی بھی تشریف لائے اور ان کی کوشش سے کچھ عرصے کے بعد مجھے اے کلاس دے دی گئی۔ میرا کھانا بنانے والا کوئی نہیں تھا اس دوران جیل خانہ جات کا جرنیل دورے پر آ گیا اور جب وہ میرے پاس پہنچا تو میں نے اس سے دو مطالبے کیے۔ ایک یہ کہ بمبئی میں میرا ایک باورچی تھا یہاں میرا باورچی نہں ہے۔ لہذا مجھے باورچی منگوا کر دیا جائے اور دوسرا یہ کہ اس جگہ کی آب و ہوا مجھے موافق نہیں ہے لہذا مجھے کسی اور جگہ بھیج دیا جائے۔ جرنیل نہایت شریف آدمی تھا۔ صوبہ سرحد میں بھی رہ چکا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے پنجاب کو منتقل کر دیتا ہے۔ اور میرے لیے پشاور سے پشتون باورچی منگوا دیتاہ۔ میں نے اسے بہت کہا کہ پنجاب مجھے لینے کو تیار نہیں ةے اور مین وہی بمبئی والا اپنا باورچی مانگتا ہوں۔ پشاوری باورچی نہیں چاہیے۔ اس کا خیال

تو نیک تھا وہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر مجھے پنجاب بھیج دیا جائے گا تو میں گھر کے نزدیک ہو جاؤں گا اور جب میرے لیے پٹھان باورچی آجائے گا تو اسے مجھ سے ہمدردی بھی ہو گی اور وہ میری خدمت بڑی اچھی طرح کیا کرے گا۔ اس نے کوشش کی لیکن پنجاب نے تو مجھے لینے سے انکار کر دیا اور پشاور جیل والوں نے ایک ایسا آدمی بھیج دیا جو کھانا پکانا تو جانتا تھا لیکن ٹی بی کا مریض تھا۔ اسے بھیجنے کا ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ جو میرے ساتھ رہے گا تو مجھے بھی ٹی بی ہو جائے گی۔

مجھے احمد آباد کے سابرمتی جیل کے ڈسٹرکٹ جیل بریلی میں بھیج دیا گیا۔ بریلی میں سنٹرل جیل بھی تھا اور اس میں سیاسی قیدی بھی تھے۔ اگر مجھے وہاں منتقل کیا ہوتا تو مجھے آرام رہتا لیکن وہ تو مجھے تکلیف دینا چاہتے تھے۔ اس طرح میری قید و بند کا دور چلتا رہا۔

ایک دن آیا کہ ڈاکٹر خان صاحب جب سنٹرل اسمبلی کے ممبر منتخب ہوگ ءے تب انہیں صوبہ سرحد جانے کی اجازت مل گئی۔ ڈاکٹر خان اور انکی اہلیہ صاحبہ مجھے ملنے کے لیے بریلی میں آئے۔ اس جگہ کے جیل خانے کے جرنیل صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ کرنل سلامت اللہ خان ان کا نام تھا۔ جب وہ دوری کرتے ہوئے اس جیل خانے میں آئے تو میں نے ان کے سامنے باورچی سے نجات دلانے کا مطالبہ رکھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرا باورچی اصل میں باورچی نہںی ہے ٹی بی کا مریض ہے۔ اسے میرے پاس اس لیے بھیجا گیا ہے کہ مجھے بھی یہی مرض لگ جائے۔ مجھے باورچی مت دیجیے لیکن اس باورچی سے میری خلاصی دلوائے۔ اسے

بھی تکلیف ہے اور مجھے بھی تکلیف ہے۔ جرنیل صاحب نے مہربانی کی اور اسے اس جگہ سے رخصت کر دیا۔ اس طرح مجھے اپنے اس باورچی سے نجات مل گئی۔

یہاں مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے رفیع احمد قدوائی بھی آئے تھے۔ جیل خانہ جات کے وزیر صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ اس وقت گرمی شرو ر ہوگئی تھی۔ انہوں نے لکھا کہ مجھے کسی ٹھنڈ جگہ پر بھیج دیا جائے لیکن حکومت نے جب تک گرمی رہی مجھے ٹھنڈی جگہ نہ بھیجا اور جب برسات شروع ہوگئی اور لوگ پہاڑوں سے میدانوں کی طرف آ رہے تھے تب مجھے الموڑہ بھیج دیا گیا۔ وہاں دو دو تین تین دن تک مسلسل بارشیں جاری رہتی تھیں اور میں بارک سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ میری قید کی میعاد پوری ہوگئی اور رہائی کے وقت مجھے پھر یہ نوٹس مل گیا کہ میں پنجاب اور سرحد میں نہیں جا سکتا۔ لہٰذا میں ۱۹۳۶ء میں پھر واپس وردھا آ گیا۔ جب ہمارے صوبے میں صوبائی اسمبلی کے الیکشن ختم ہو گئے تو اگست ۱۹۳۷ء میں اپنے صوبہ میں چلا گیا۔

☆☆☆

سرحد اسمبلی کے انتخابات

۱۹۳۷ء میں سرحد اسمبلی کے الیکشن ہو گئے اس میں اکثریتی پارٹی خدائی خدمت گاروں کی تھی۔ مگر گورنر نے وزارت بنانے کی دعوت سر نواب صاحبزادہ عبدالقیوم کو دی تھی۔ جسے اس کے اپنے حلقے میں خدائی خدمت گاروں کے ہاتھوں شکست فاش کھانی پڑی تھی۔ اور ضلع ہزارہ کے غیر پختون حلقے سے کامیابی ہوئی تھی۔ حکومت کی امداد سے ہندو، سکھ اور آزاد ممبران کا تعاون اسے حاصل ہو گیا اور اس نے اپنی وزارت قائم کی لیکن وہ بہت دن چل نہ سکی۔ اور وہ پانچ چھ ماہ کے بعد شکست کھا گئے۔ ۳ دسمبر ۱۹۳۷ء کے دن جب صاحبزادہ کے خلاف تحریک عدم اعتماد منظور ہو گئی تو ڈاکٹر خان صاحب نے خدائی خدمت گار ممبران کے تعاون سے وزارت بنائی۔ اس وزارت میں قاضی عطا اللہ صاحب وزیر تعلیم تھے قاضی صاحب نے پرائمری تک سکولوں میں پشتو تعلیم جاری کرنے کے علاوہ اس زبان کو لازمی قرار دے گیا اور اس وزارت نے لوگوں کی بہبودی کے لیے اور بھی تھوڑے بہت کام کیے تھے۔

اس وزارت نے سب سے پہلے جو کام کیا تھا وہ یہ تھا کہ پشتو زبان ملک میں رائج کر دی۔ انگریزوں نے اس زبان سے بڑی بھاری بے انصافی کی تھی۔ ہندوستان بھر میں ہندوستانی بچوں کو ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں دی جاتی تھی لیکن ایک پشتون قوم تھی کہ اس کے بچے اس سے محروم کیے گئے تھے۔

اس وزارت نے ہماری تحریک کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچایا۔ کیونکہ

دراصل طاقت اور اختیار گورنر کے ہاتھوں میں تھے۔ اور ماتحت افسر نہ تو وزیروں کا حکم مانتے تھے اور نہ ہی وزیروں سے تعاون کرتے تھے۔ وہ گورنر کی آنکھ کے اشارے کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ وہ جیسا اشارہ کرتے تھے وہ ویسا ہی کام کرتے تھے۔ دوسری یہ بات تھی کہ ہم تو محض آٹھ آنے حاصل کیے تھے اور قوم مانگتی تھی پورا روپیہ۔ لیکن ہمارے پاس روپیہ کہاں تھا۔ علاوہ ازیں ہماری تحریک میں سنڈیکیٹ کی ایک نئی بلا بھی نازل ہوگئی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ ہمارے کارکن دیانت داری اور ایمانداری سے کنٹرول کی چیزوں کی تقسیم نہیں کرپاتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں جنگ شروع ہوگئی اور ہندوستان کی تمام صوبوں کی کانگریسی وزارتوں کے ساتھ ہماری وزارت بھی مستعفی ہوگئی۔

جس وقت جنگ میں جاپان بھی شامل ہوگیا تھا اس وقت ورت میں (پونا ہونا چاہیے) کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ ہم جنگ میں انگریزوں کی مدد کرنے کو تیار ہیں لیکن اس شرط پر کہ انگریز جنگ کے بعد ہمیں آزادی دینے کا اعلان کردیں''۔ اس موقع پر میں نے اور مہاتما گاندھی نے کانگریس ورکنگ کمیٹی سے استعفے دے دیے کیونکہ ہم تشدد کے قائل نہیں تھے اور جنگ میں انگریزوں کی امداد کرنے کے معنی کو تشدد کو تقویت پہنچانا تھا۔

☆☆☆

صوبہ سرحد میں ستیہ گرہ کی تحریک

اس اجلاس کے بعد ملک میں انفرادی ستیہ گرہ شروع ہوگیا تھا' لیکن مہاتما جی کی منظوری کے بغیر کسی کو ستیہ گرہ کے کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ صوبہ سرحد میں گاندھی جی نے اپنے یہ اختیارات مجھے منتقل کر دیے تھے۔ صوبہ سرحد میں ستیہ گرہیوں کو گرفتار نہیں کیا جاتا تھا چونکہ انگریز اس جنگ کو بار بار آزادی اور جمہوریت کی جنگ کا نام دیتے تھے لیکن ہندوستان کو آزادی دینے کا نام نہیں لیتے تھے اس لیے کانگریس نے مجبور ہو کر انگریزوں کی غیر ملکی حکومت کیخلاف ایک اجتماعی تحریک شروع کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ کانگریس نے ۸ اگست ۱۹۴۲ء کے روز بمبئی میں انگریز کے خلاف ''بھارت چھوڑو'' نام سے ایک قرارداد منظور کی۔ اس قرارداد کی رو سے انگریزوں سے سارے ہندوستان اور صوبہ سرحد میں یہ مطالبہ کیا جاتا تھا ''اے انگریزو ہندوستان خالی کر دو' یہاں سے نکل جاؤ'' جہاں انفرادی ستیہ گرہ کے دوران ستیہ گرہی ملک کے عوام سے کہتے تھے کہ ''انگریزوں کو موجودہ جنگ میں مالی و جانی امداد گناہ ہے۔ یعنی چندہ اور بھرتی نہیں دینا چاہیے'' وہاں اجتماعی تحریک میں ہر ایک انگریز کے خلاف ''بھارت چھوڑو'' کا نعرہ لگایا جاتا تھا اور انگریز حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کر کے ہزاروں لوگ گرفتار ہوتے تھے۔ انہی دنوں ہم نے سردیاب کے کنارے خدائی خدمت گاروں کا ایک مرکز قائم کیا جس کا نام ''مرکز اعلیٰ خدائی خدمت گاران'' تھا۔ ہندوستان میں سول نافرمانی شروع ہوگئی تھی لیکن صوبہ سرحد میں ابھی

تک ہ نے شروع نہیں کی تھی۔

جس وقت ہم نے سول نافرمانی کرنے کا فیصلہ کیا تو ہمارے جرگے کے تمام اختیارات مجھے دے دیے گئے اور میں ہی سول نافرمانی کی تحریک چلانے کے لیے ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا۔ دراصل میں تو لفظ ڈکٹیٹر ہی سے لرزتا ہوں کیونکہ مطلق العنانی اور ڈکٹیٹری میری فطرت میں موجود نہیں ہے اسے میں پسند نہیں کرتا اسی لیے جو کچھ بھی کرتا ہوں یا ہر وہ حکم جو میں دیا کرتا اس کے بارے میں سب سے پہلے اپنے ساتھیوں سے صلاح ومشورہ کر لیتا یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس وقت سول نافرمانی کرنے یا نہ کرنے کا سوال پر جرگے میں بحث جاری تھی تو ہزارہ کے فقیر حاجی خان نے یہ تجویز پیش کی کہ ہمیں ٹیلی فون کے تار کاٹنے اور ریل کی پٹریاں اکھاڑنے کی اجازت دی جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں صرف اس شرط پر مان سکتا ہوں کہ جو آدمی ریل کی پٹری کو نقصان پہنچائے یا تار کاٹے اسے چاہیے کہ وہ یہ کام کر کے خود پولیس تھانے میں جا کر اور پوری صاف گوئی و جرات کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہہ دے کہ ''یہ کام میں نے کیا ہے'' اس سے ایک تو پشتونوں کے اندر اخلاقی جرات پیدا ہو جائے گی اور چونہ وہ یہ جرات آمیز کام کھلے بندوں کریں گے تو اس سے اس غیرت بھرے اعلان کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگوں میں بھی اخلاقی جرات کی ایسی ہی عادت پیدا ہو جائے۔ اور تیسری بات یہ ہو گی کہ اس کے کام کی وجہ سے اور لوگوں پر بے جا شک وشبہ نہیں ہوگ اور خدا کی مخلوق آزاد اور سختی کا شکار نہیں ہو گی۔

بہر حال میری ہدایت اور ڈسپلن کے تحت خوب زور وشور سے سول نافرمانی شروع ہوگئی۔ فیصلے کے مطابق ہم لوگ عدالتوں اور کچہریوں پر چھاپے مارتے تھے۔ بنوں، کوہاٹ، ٹانک اور پشاور میں عدالتوں پر حملے شروع ہو گئے تھے۔ انگریزوں کی طرف سے ہماری اس تحریک کا جواب بڑی سختی سے دیا گیا۔ لیکن پشاور کے ایک مسلمان ڈپٹی کمشنر نے انگریزوں کی روایتی وفاداری مین انگریزوں سے بھی زیادہ اپنی انگریز پرستی کو اونچا اچھالا اور انگریزی کی یہ مثال درست ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "بادشاہ سے بھی زیادہ بادشاہی کا خیر خواہ نکلا"۔ اس ذات شریف کا نام جناب اسکندر مرزا تھا۔ جہاں انگریز حکمران اپنے علاقوں میں اپنی فوجوں کو لوگوں پر لاٹھی چلانے کا حکم دیتے تھے جناب مرزا بذات خود اٹھ کھڑے ہو جاتے اور لاٹھی ہاتھ میں لے کر خدائی خدمت گاروں کو مار مار کر ادھ موا کر دیتے تھے۔ حتہ کہ ایک خدائی خدمت گار ان کی لٹھ بازی سے شہید ہو گیا۔ اس خدائی خدمت گار کا نام سید اکبر تھا جناب مرزا کے کارناموں میں ایک اور شریفانہ واقعہ بھی لکھ دینا چاہے آپ نے خدائی خدمت گاروں کے کیمپ میں ان کے سالن مین ایک دن زہر ڈال دی تھی اور اس سے وہ تمام خدائی خدمت گار جنہوں نے کھانا کھالیا تھا وہ ایسے بیمار ہوئے کہ موت کے دروازے پر پہنچ گئے۔

ان مرزا صاحب کے ہم پٹھانوں پر اور بھی بہت سے احسانات ہیں لیکن ان پر پردہ ڈالتا ہوں اور انہیں اس خدا کے سپرد کرتا ہوں جس کے پاس ہم سب کو ایک دن حاضر ہونا ہے۔ مرزا صاحب بعد میں پاکستان کے صدر مملکت بھی بن گئے تھے اور وہ

اسلام اسلام اور وطن پرستی کے نعرے بھی لگانے لگ گئے تھے اور میں بھی ان کی صدارت کے دوران وطن دشمنی اور ناانصافی کے الزام میں جیل میں قید و بند کی اذیت اٹھاتا رہا۔

خیر میں وقتاً فوقتاً ستیہ گرہ کا حال معلوم کرنے کے لیے اپنے صوبے میں پھرتا رہتا تھا۔ ایک دن میں کوہاٹ کی طرف جا رہا تھا کہ درے کے سینیہ تھانے میں مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ مجھے موٹر میں بٹھا کر پشاور لے جایا گیا اور وہاں مجھے چھوڑ دیا گیا۔ اسی طرح میں جہاں بھی جاتا تھا یہ لوگ انگریز حکومت کی پولیس مجھے گرفتار کرلیا کرتے تھے اور مجھے واپس بلا کر چھوڑ دیتے تھے' لیکن مجھے یہ سلوک پسند نہیں تھا' اس لیے میں نے پچاس آدمیوں کا ایک جتھا بنایا اور ہم لوگ چارسدہ سے پیدل پا مردان کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم جگہ جگہ جلسے کرتے تھے۔ جس وقت ہم لوگ میروس ڈھیری میں پہنچے تو یہاں ہمارے لیے پولیس بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایسی زنجیر بنا رکھی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے اور اگر پولیس والے ہمیں جدا کر بھی دیتے تھے تو بھی ہماری یہ کوشش ہوتی تھی کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں پسلیس نے لاٹھیاں سنبھال لیں اور ہم پر تابڑتوڑ برسانی شروع کردیں۔

انگریز کی حکومت نے ہماری تحریک کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر دشمنی اور سختی کے باوجود ہمیشہ میری عزت کی تھی اور شخصی طور پر انہوں نے کبھی میرے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کیا تھا جس سے میری بے عزتی ہوئی ہو یا مجھے مار پیٹ کی گئی ہو یا مجھے

زخمی کیا گیا ہو۔

مثال کے طور پر ایک دفعہ میں ایبٹ آباد کے جیل خانے میں تھا۔ ہمارے جیل خانہ جات کے جرنیل مسٹر اسمتھ دورے پر آئے تھے اور سیدھے مجھے دیکھنے کے لیے جیل میں چلے آئے۔ میں جیل میں ایک چھوٹی سی کوٹھری میں تنہا اور اکیلا الگ تھلگ بند تھا۔ اسمتھ صاحب نے میرے ساتھ علیک سلیک کے بعد باہر جا کر سپرنٹنڈنٹ جیل کی طرف دیکھ کر غیض و غضب بھرے ہوئے لہجے میں کہا ''باچا خان کو تم نے کبوتروں کی کوٹھری ڈربے میں ڈالا ہوا ہے تم نے اسے ہسپتال کے بڑے کمرے میں کیوں نہیں بھیجا''۔

اس نے سمتھ صاحب کو بڑے ادب اور آہستگی سے کہا ''حکومت سرحد کا حکم ایسا ہی ہے میں کیا کر سکتا ہوں''۔

سمتھ صاحب نے اسی وقت اسی جگہ سے گورنر سرحد کو ٹیلی فون کیا اور ان سے کہا۔ ''جارج کنگھم کیا کوئی ایک بہادر دشمن سے ایسا سلوک کرتا ہے جیسا آپ نے باچا خان کے ساتھ روا کر رکھا ہے''۔

کنگھم اپنے کرتوتوں پر شرمندہ ہوا اور اس نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ لیکن سمتھ صاحب نے اس سے پہلے ہی مجھے کسی اچھی جگہ منتقل کرنے اور میرے لیے اچھے ساتھی مہیا کرنے کا حکم دیا تھا چنانچہ میر الٹر کا ولی اور دیگر تین ساتھی میرے پاس بھیج دیے گئے تھے۔ حالانکہ میں نے اسمتھ صاحب سے ایسی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ جس وقت وہ مجھے ساتھی دینے لگے تو انہوں نے مجھ سے دریافت ضرور کیا تھا

کہ مجھے کون سے ساتھی چاہئیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ جو انہیں پسند ہوں' لیکن سمتھ صاحب نے میرے پاس جواب بھیجا تھا کہ یہ ساتھی انہیں اپنے لیے تو نہیں چاہئیں۔ یہ میرے لیے ہیں اس لیے مناسب ہے کہ میں خود اپنی پسند کے ساتھ طلب کروں وہ مجھ پر اپنی پسند ٹھونسنا نہیں چاہتے۔

سمتھ صاحب کے اس فراخدلانہ سلوک کا ذکر کرتے ہوئے یہاں مجھے پاکستان کا حکومت کے رویے کی بات بھی یاد آتی ہے میں اس کی عمل داری میں ہمیشہ قید تنہائی ہی میں رکھا گیا اور جتنا بھی چیخا چلایا کہ مجھے ایک ساتھی تو دے دیں لیکن کسی نے مجھے ممنون نہیں کیا۔ اور اگر کوئی ساتھی دیا بھی تو وہ پاگل تھا یا مریض۔ جو میرے لیے تکلیف اور سر دردی کا موجب بنا۔ لیکن انگریزوں کی حکومت میں کچھ دیسی ملازم اس عقیدے کے ضرور تھے جو یہ سوچتے تھے کہ اگر وہ مجھے شخصی طور پر ضرر پہنچائیں گے یا میری بے حرمتی کریں گے اور انگریز ان کی اس وفاداری سے باخبر ہو جائیں گے تو وہ اس انگریز پرستی کے طفیل دنیاوی زندگی میں ترقی کر لیں گے۔ میروس ڈھیری کے اس واقعے میں بھی ہمیں ایک ایسے حقیر پولیس افسر سے واسطہ پڑا۔ انہوں نے مجھے اس قدر مارا پیٹا کہ میری دو پسلیاں ٹوٹ گئیں وہ آدمی پولیس کا انسپکٹر خوش دن خان تھا جس کے نام کے معنے اچھے دل والے خان کے ہیں تو اچھے دل والے اس خان صاحب نے اپنے لیے انگریزوں کی وفاداری کی فہرست میں جگہ تو بنا لی لیکن متمدن دنیا کے سامنے یہ کسی اچھے نمونے کا انسان اپنے آپ کو پیش نہیں کر سکا خدائی خدمت گاروں سے اس کے سلوک کا اندازہ ناظرین میرے ساتھ اس کے

سلوک سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔انہوں نے ہم سب کو پکڑ لیا اور مردان جیل میں لے گئے۔ دوسرے دن ہمیں رسالپور پہنچا دیا گیا اور اس جگہ سے ہمیں ہری پور جیل میں لے آئے۔

☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

پٹھانوں میں اتحاد کی کوششیں

جنگ کے زمانے میں جب جاپانی افواج برما میں پہنچ گئیں تو ہمیں فکر لاحق ہو گیا کہ جاپانی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور اگر ان کی یہی رفتار رہی تو وہ بہت جلد یہاں پہنچ جائیں گے۔ ہم اپنے قبائل کے لیے متفکر ہو گئے۔ ہم چاہتے تھے کہ آنے والی مصیبت کا مقابلہ ایک جگہ اکٹھے ہو کر وطن پرستی کے جذبے کے ساتھ وطن کی حفاظت کے لیے کریں۔ اس لیے ضروری تھا کہ ہمارا بھائی چارہ ہو۔ ہمارا ایک ہی مشورہ ایک ہی اصلاح اور ہم سب کا ایک مشترکہ راستہ ہو۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ قبائلی علاقے میں ہم اپنے وفد بھیجیں۔

اس وقت جارج کننگھم ہمارے گورنر تھے۔ میں نے انہیں ایک خط لکھا کہ وہ ہمیں اجازت دیں تاکہ ہم اپنے آدمی قبائل میں بھیج دیں۔ چونکہ انگریز ہمیں اصلاحی اور تعلیمی کاموں کے لیے بھی قبائلیوں میں نہیں جانے دیتے تھے۔ اس لیے گورنر نے مجھے جواباً لکھا وہ ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس پر ہم نے اپنا جرگہ بلا لیا۔ اور گورنر بھی اپنے پولیٹیکل ایجنٹوں کو صلاح و مشورے کے لیے بلا لیا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ ہماری اموات اور زندگی کا سوال ہے چاہے حکومت ہمیں اس کی اجازت دے یا نہ دے ہم اپنے وفد ضرور قبائلی علاقوں میں بھیجیں گے۔ دوسری طرف سرحد کی حکومت نے پولیٹیکل ایجنٹوں کے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ ہمیں خدائی خدمت گاروں کو یہاں تو کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن جب ہم

قبائلیوں میں آ جائیں گے تو ہماری اچھی طرح سے کبر لیں گے۔ہم نے آفریدیوں' مسعودوں اور باجوڑ میں ایسے وفد بھیج دیے۔ ہمارے آفریدیوں می ضانے والے وفود کوکسی قسم کی مشکلات پیش نہ آئیں اور وہ اپنی اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔لیکن ہمارے اس وفد کو جو باجوڑ جا رہا تھا بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔خدائی خدمت گاروں پر مشتمل اس وفد کے راستے میں مالاکنڈ کے پولیٹکل ایجنٹ نے رانا زئی کے قبیلہ کے خوانین کو بٹھا رکھا تھا۔ جب ہمارا وفد سخاکوٹ میں پہنچا تو ان خواتین نے اسے روک لیا۔اور واپس چلے جانے کی ہدایات کرتے ہوئے کہا کہ وہ وفد کو اپنے علاقے میں گھسنے نہیں دیں گے۔

اس وفد کا رہنما کامدار خان تھا۔اسنے ان سے کہا''دیکھیے خاں صاحبان ہم لوگ خدائی خدمت گار ہیں اور آپ لوگوں کی خدمت کے لیے آئے ہیں چونکہ ہمارے ملک مس ایک عظیم مصیبت آنے والی ہے اور اس کے پیش نظر ہم اس مقصد کے لیے آپ کے علاقے میں جانا چاہتے ہیں۔کہ آپ لوگ اور ہم لوگ آپس میں سر جوڑ کر بیٹھ جائیں اور آنے والی مصیبت کا تدارک کریں''۔لیکن خان صاحبان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی انہیں تو فرنگی پولیٹکل ایجنٹ نے بھیجا تھا اور پولیٹکل ایجنٹ ان کا مطلق العنان حکمران تھا۔وہ بس یہی رٹ لگاتے تھے کہ وہ ہمیں اپنے ملک میں گھسنے نہیں دیں گے۔

کامدار خان نے انہیں بہت سمجھایا کہ ہم جب ایک دفعہ قدم آگے رکھ دیتے ہیں تو اس قدم کو پیچھے نہیں ہٹاتے۔اس پر ان خوانین سے بحث شروع ہوگئی اور یہ قیل و

قال سن کر بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔خوانین کا ارادہ تھا کہ وہ زور زبردستی سے خدائی خدمت گاروں کو اپنے علاقے سے باہر نکال کر دیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ عام لوگوں کو ہمدردی خدائی خدمت گاروں کے ساتھ ہے اگر وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرتے ہیں تو عوام ان سے جنگ کرنے کو تیار ہے۔تب انہوں نے خدائی خدمت گاروں کو چھوڑ دیا۔

اس کے بعد خوانین میرے پاس مرکز میں آئے میرے ساتھ بھائی چارے عزیز داری اور قوم پرستی کی باتیں کرنے لگے اور انہوں نے میری بہت منت سماجت کی کہ یہ خدائی خدمت گار وفد مالاکنڈ کے راستے باجوڑ کو نہ جائے دوسرے راستے سے چلا جائے۔ چنانچہ میں نے کامدار خان کو لکھ دیا کہ وہ مالاکنڈ کا راستہ چھوڑ دیں اور اتمان قبیلوں کے راستے سے باجوڑ چلے جائیں۔ وفد نے وہ راستہ ترک کر دیا۔ اور آگرے کے راستے سے اتمان قبیلوں کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں کاکا خیل میاؤں (میاں لوگ یا میاں خیل) نے ان کو روک لیا۔ اور جب ہمارے خدائی خدمت گار ان کے گاؤں کے قریب سے گزر رہے تھے تو یہ میاں لوگ باہر نکل آئے اور بغیر کسی وجہ سے ان پر ٹوٹ پڑے۔انہیں اٹھا اٹھا کر نیچے پٹکا اور بڑی بے دردی سے مارا پیٹا۔انہوں نے خدائی خدمت گاروں پر جو روستم اس لئے روا سمجھا کہ کسی طرح پولیٹکل ایجنٹ کو یہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے خدائی خدمت گاروں کے ساتھ ایسا نامناسب برتاؤ کیا ہے۔"کاکا خیل" یہاں لوگوں کی بدقسمتی سے اکثریت ہر دور میں وقت کی حکومت وفادار رہی ہے۔حتیٰ کہ چترال تک یہی لوگ انگریزی

فوجوں کے آگے آگے گئے تھے اور لوگوں کے مال و دولت لوٹنے میں پیش پیش رہے تھے۔

ہمارا یہ وفد جب باجوڑ پہنچ گیا تو وہاں بادشاہ گل صاحب نے ان کے لیے بڑی مشکلات پیدا کر دیں۔ اس نے لوگوں میں یہ پروپیگنڈہ کیا کہ ان کے علاقے میں ایسے لوگ آ رہے ہیں جنہوں نے سرخ کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہندو ہیں اور ان کے قتل کر دینے میں بڑا ثواب ملتا ہے۔ بادشاہ گل صاحب نے ہمارے خلاف یہ سارا پروپیگنڈہ افغانستان کے وزیر اعظم ہاشم خان کے ایما پر کیا تھا۔ کیونکہ بادشاہ گل انہیں ہاشم خاں کا آدمی تھا اور ہاشم خاں کو انگریزوں نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس وقت ہاشم خان افغانستان کا وزیر اعظم تھا۔

ایک موقع پر باجوڑ میں گاؤں کے نوجوان اس بات کے لیے تیار ہو گئے تھے کہ ہمارے خدائی خدمت گاروں کی چاند ماری کر دیں یعنی انہیں گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیں۔ لیکن ان کے بزرگوں نے ان سے کہا کہ تم لوگ ذرا صبر سے کام لو۔ یہ سرخ پوش کہیں جا تو سکتے نہیں ہم ان سے پوچھ تو لیں"۔

جب خدائی خدمت گار گاؤں کے حجرے میں بیٹھ گئے تو ان لوگوں نے ان سے یہ پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتے ہیں؟

اس استفسار کا جواب دینے کے لیے عبدالمالک استاد جو ہم پٹھانوں کا ایک عظیم قومی شاعر تھا کھڑا ہو گیا اور بولا ہم لوگ آپ کے بھائی ہیں۔ خدائی خدمتگار ہیں اور ہمیں باچا خان نے آپ لوگوں کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ اس ملک میں بھیانک

مصیبتوں کا ایک بڑا سیلاب آ رہا ہے۔ اس موقع پر ہم سب پشتونوں کو متحد ہو جانا چاہیے اور اس سیلاب کا سدباب کرنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ اس سیلاب میں ہم بہہ جائیں اور تباہ ہو جائیں۔ عبدالمالک کے ان الفاظ کا ان لوگوں پر خوب اثر ہوا اور انہوں نے اپنے نوجوانوں کو بڑی لعنت ملامت کی بادشاہ گل کی انتہائی مخالفانہ کوششوں کے باوجود یہ وفد بہت زیادہ کامیاب ہوا اور اس نے باجوڑ میں قابل تعریف کام کیا۔

ہاشم خان کا مخالفانہ اور دشمنانہ رویہ یہیں تک محدود نہیں تھا۔ جب ہم انگریزوں کی کچہریوں میں چھاپے مار رہے تھے تو ہاشم خان نے اسی بادشاہ گل کو حاجی محمد امین کے ہمراہ ہمارے خلاف کام کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ حاجی محمد امین جلال آباد کے نزدیک افغانستان میں وہ اڈہ نام کے گاؤں میں رہ رہا تھا۔ اور وہ کسی وقت حاجی صاحب ترنگ زئی کا خلیفہ تھا۔ ہاشم خان نے اسے ہمارے خلاف انگریزوں کی خاطر بھیجا تھا تاکہ وہ ہمارے لوگوں پشتونوں کی توجہ انگریزوں کی طرف سے ہٹا دے۔ حاجی محمد امین جب پشاور پہنچا تو اس نے انگریزوں کی عدالتوں پر خدائی خدمت گاروں کی طرف سے ہو رہے دھاؤں کے مقابلے میں پیشہ ور عورتوں کے چکلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیے ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کی توجہ انگریزوں سے ہٹا کر ادھر مبذول کر دے۔ لیکن وہ لوگوں کی توجہ جنگ آزادی سے دوسری طرف ہٹا نہ سکا۔ کیونکہ ہم نے **ملک** میں کام کیا تھا اور ہمارے لوگوں میں اتنی سوجھ بوجھ آ چکی تھی کہ انہیں اسلام کے نام

پر گمراہ کرنا اور دھوکہ دینا ممکن نہیں تھا۔ بادشاہ گل صاحب کے باپ حاجی صاحب آف ترنگ زئی بذات خود بہت اچھے انسان تھے اور ہمارے پکے ساتھی تھے۔ لیکن بادشاہ گل یہ ساری مخالفت پیسوں اور اقتدار کے لالچ سے کر رہا تھا اس لیے گئوشالہ میں دو شیر دار گائیں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک شیر دار گائے انگریزی حکومت اور دوسری افغانستان۔

☆☆☆

ہری پور جیل میں

ہری پور ی ہزارہ کی سنٹرل جیل میں ہمارے ہزاروں ساتھی قید تھے۔ان میں سے اکثر رہا ہو گئے اور تھوڑے سے رہ گئے تو پھر مجھے واپس ہری پور جیل میں بھیج دیا گیا۔ہم میں اکثر قیدی نظر بند تھے۔ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسے نکمے بیٹھے نہیں رہیں گے کوئی کام کریں گے اور ہم نے حکومت سے کہہ دیا کہ ہمیں نواز بننے کا کام دے دیا جائے۔ان دنوں پچیس فٹ نواڑ بننے کی مزدوری آٹھ آنے دی جاتی تھی ہمارے بہت سے آدمیوں نے بڑے پیسے کما لیے۔لیکن یہ پیسے کوئی بھی ساتھی اپنی ضروریات پر خرچ نہیں کرتا تھا۔یہ سب پیسے ہم لوگ اپنے مرکز کو بھیجتے تھے۔ دوسرا یہ کام ہم نے کیا کہ یہاں ہمارے بہت سے خدائی خدمت گاروں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔

اس موقع پر مجھے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ میں ایجنسیوں کے متعلق بھی تھوڑی سی وضاحت کر دوں۔پشتونوں کے ملک کی تقسیم جو پہلے انگریزوں نے اور اب پاکستان میں جس طریقے سے کی ہے اس کی ایک طرف ایک جگہ پر بھی میں نے کہیں اشارا کیا ہے۔یہاں میں اس مکروہ انتظامی تقسی کے سلسلے میں صرف ایجنسی کو لیتا ہوں۔

صوبہ سرحد کا وہ علاقہ جو گورنر کے زیر اثر قانونی طور پر اسمبلی کے ذریعے منظم کیا جاتا ہے اسے اضلاع بندوبستی کا نام دیا جاتا ہے۔اس علاقے اور آزاد قبائل کے

درمیان ایک بفرزون ایجنسیوں کا ہے۔ یہ علاقہ پولیٹکل ایجنٹ کے براہ راست زیر حکومت ہوتا ہے اس میں کسی قسم کا نہ تو کوئی قانون ہے اور نہ عدالت...... یہاں تک کہ پولیٹکل ایجنٹ کے کسی حکم کے خلاف اپیل کرنے کی کسی کو بھی اجازت نہیں ہے۔ ایجنسیوں کے لوگ بے چارے جاہل مظلوم اور اس حد تک معتوب ہوتے ہیں کہ ایک واحد شخص کے حکم سے مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں۔

ایجنسی کے لوگوں کو بندوقیں رکھنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اور انہیں یہ اجازت بھی ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں۔ ایک دوسرے کا مال غضب کر لیں اور ایک دوسرے کے دشمن بنے رہیں تا کہ ہمیشہ پولیٹکل ایجنٹ کے رعب کے نیچے وہ خوشامد کر کے اپنی جان بچانے کے لیے اس کے آسرے پر زندگی بسر کرتے رہیں۔ اس بفرزون کے قیام کی غرض و غایت یہ تھی کہ اگر قبائلی صوبے میں بندوبستی اضلاع پر کہیں حملہ کر دیں یا ڈاکہ ڈالیں تو وہ پہلے ان لوگوں یعنی ایجنسیوں سے گزرنے پر مجبور ہوں اور یہ لوگ ایجنسیاں اپنے سینے ڈھال بنا کر ان کے مقابلے کے لیے کھڑے ہو جائیں یہ لوگ اتنے محکوم اور مظلوم ہیں کہ پولیٹکل ایجنٹ کا ادنیٰ اشارہ ان کے لیے اگر وہ زندگی بسر کرنا چاہیں کافی ہوتا ہے۔ یہ لوگ آزاد قبائل کی طرح آزاد نہیں ہوتے اور دوسری طرف محکوم صوبے کی مانند قانون اور عدالت کے سایے سے بھی محروم ہوتے ہیں اور اس علاقے میں پہلے انگریزی فوجیں باڈر پولیس اور لیوی اور اب پاکستان کی فوجیں ہمیشہ ڈیرہ ڈالے رہی ہیں۔

میں نے جیل خانے میں مرغیاں پالی تھیں اور میں مرغیوں سے انڈے نکلواتا

تھا۔اوراس کی آمدنی سے جتنے پیسے میرے ہاتھ لگتے تھے وہ میں مرکز کو دیا کرتا تھا مرغیوں کے ان بچوں کو میں اپنے ہاتھ سے خوراک کھلاتا تھا جس وقت ان کے کھانے کا وقت ہوتا تھا وہ میرے اردگرد خود بخود جمع ہو جاتے تھے۔ میں ان کے لیے ہاتھوں میں آٹا لیے ہوتا تھا۔اس لیے کوئی چوزہ میری بغل میں بیٹھ جاتا کوئی میرے ہاتھوں پر بیٹھ جاتا اور کوئی میرے سر اور کندھوں پر آ کر بیٹھتا۔ایک دن کرنل سمتھ جو جیل خانہ جات کے جرنیل تھے ہری پوری کے دورے پر آئے۔انہوں نے ۱۹۳۰ء میں ہری پور جیل میں سیاسی قیدیوں پر بڑی سختیاں کی تھیں اوران پر بڑے مظالم توڑے تھے۔وہ اس وقت جیل کے سپرنٹنڈنٹ تھے لیکن اب بہت بدل چکے تھے اور بہت مخلص المزاج بن گئے تھے۔ ہمارے ساتھ ان کو بہت انس ہو گیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فرنگی انگریز ایک قوم پرست اور بہادر قوم ہے اور انہیں قوم پرستوں اور بہادر آدمیوں سے دل ہی دل میں بڑا انس تھا۔اوران کی وہ قدر کرتے تھے۔سمتھ صاحب نے جونہی مجھے مرغیوں اور چوزوں میں مشغول دیکھا تو انہوں نے اپنے ہمراہیوں کو رخصت کیا اور خود چھپ چھپ کر میرے پیچھے آ کھڑے ہوئے اور یہ تماشہ دیکھنے لگ گئے۔تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے مجھے گڈ مارننگ ''سلام سحر'' کہا۔ میں نے جب پیچھے کی طرف دیکھا تو سمتھ صاحب موجود تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ''یہ کیا کر رہے ہو؟'' میں نے انہیں جواب دیا کہ آپ ذرا اس بات کو تو سوچیے کہ اس میں انسان کے لیے ایک بہت بڑا سبق پوشیدہ ہے دیکھ لیجیے کہ یہ جانور بھی جانتا ہے کہ میں اس کا دشمن ہوں۔اور اسے حلال کرنے کے لیے

پال رہا ہوں، لیکن چونکہ میں اس سے پیار کرتا ہوں، اسلیے دیکھیے یہ کس طرح میری بغل میں اور ہاتھوں پر بیٹھے ہوئے ہیں کیا یہ بات انسان کے لیے ایک بہت بڑا سبق نہیں ہے؟ جب ہم پیار سے حیوان کو اپنا دوست بنا سکتے ہیں تو انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے کیوں اپنا دوست نہیں بنایا جا سکتا؟

یہ سمتھ صاحب عجیب وغریب انسان تھے وہ کہا کرتے تھے کہ اگر پاکستان بن گیا تو وہ اس میں ایک دن کے لیے بھی نہیں رہیں گے چنانچہ جس دن پاکستان بننے کا اعلان ہو رہا تھا تو وہ واقعی اس دن صبح سویرے ریل گاڑی میں سوار ہو کر صوبہ سرحد سے انگلستان روانہ ہو گئے۔

۱۹۴۵ء میں ہمارے وزیروں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے اس صوبے کے لیے وزارت فائدہ مند ہے اور اگر انہوں نے وزارت لے لی تو کاموں کے علاوہ ان کے ساتھی سیاسی قیدیوں کو بھی رہا کر دیا جائے گا جو تین تین سال سے جیلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک وفد گاندھی جی کے پاس بھیجا تھا۔ جس نے گاندھی جی کو بتایا تھا کہ ہندوستان کے حالات صوبہ سرحد کے حالات سے جدا ہیں۔ گاندھی جی نے انہیں سیاسی قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں اجازت تو دے دی تھی لیکن انہوں نے وفد سے یہ بھی کہا تھا کہ باچا خان یعنی مجھ سے پوچھ لے۔ چنانچہ ممبروں کا یہ وفد میرے پاس جیل خانے میں آیا اور سارے حالات سے مجھے آگاہ کیا۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ انگریز تو مجھے چھوڑیں گے نہیں۔ اور اگر انہوں نے وزارت قائم کر لی تو ان تمام خدائی خدمت گاروں کو وہ رہا کر دیں گے۔

لیکن وہ مجھے قائل نہ کر سکے۔ میں نے انہیں کہہ دیا کہ آپ لوگ ہم سیاسی قیدیوں کی کوئی فکر نہ کریں ہم قید میں تنگ نہیں ہیں۔ اور ایسی وزارتیں جس کو کوئی اختیار حاصل نہ ہو اسے لے لینے میں مجھے نقصان تو نظر آتا ہے اور میری رائے وزارت لینے کے حق میں نہیں تھی، لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ آیا اور کارکنوں نے انہیں رائے تھی کیونکہ مارچ ۱۹۴۵ء میں جونہی جیل خانوں سے رہا ہو کر باہر آئے تو ہم نے اپنا کام شروع کر دیا۔ لیکن حکومت اور اس کے سب پرزے ہمارے خلاف زور شور سے کام میں منہمک تھے۔ ہمیں اورنگ زیب کی وزارت نے بڑا فائدہ پہنچایا تھا اور لوگوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ مسلم لیگ کی وزارت نے لوگوں کے لیے کیا کیا ہے۔ اور کانگریس منسٹری یا خدائی خدمت گاروں کی وزارت نے عوام کے لیے کیا کچھ کیا ہے اورنگ زیب تو لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا وہ تو اپنے عہد وزارت میں وہی کچھ کرتا رہا جو کچھ انگریز اسے کہتے تھے اور جس میں ان کا اپنا مفاد ہوتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت باوجود اس کے کہ اس کے ہاتھ میں چنداں اختیارات نہیں تھے پھر بھی اس نے لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ ان کی وزارت انگریزوں کی کٹ پتلی نہیں بلکہ لوگوں کی ہمدردانہ محبت تھی۔

☆☆☆

انتخابات میں مسلم لیگ کی دھاندلی

میں الیکشن کے حق میں نہیں تھا۔ میں کہتا تھا کہ ہم الیکشن چاہے جیت بھی جائیں اور ہماری وزارت بھی بن جائے لیکن جب ہم لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تو ہم ایسی وزارت لے کر کیا کریں گے؟ ہم تو وزارت حکومت کرنے کے لیے نہیں لیتے ہم اگر وزارت لیتے ہیں تو خدمت خلق کے لیے لیتے ہیں۔

کلکتہ میں ورکنگ کمیٹی اور پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ تھی۔ میں بھی اس میں شامل تھا۔ میں نے صوبہ سرحد کے مفصل حالات اور واقعات بیان کرنے کے بعد گاندھی جی سے کہا کہ میں اس الیکشن میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہتا۔ گاندھی جی نے اس بات پر مجھ سے اتفاق کیا۔ پارلیمنٹری بورڈ نے بڑی کوشش کی کہ مجھے کسی طرح الیکشن میں حصہ لینے کے لیے راضی کرلے۔ لیکن وہ مجھے آمادہ اور رضامند نہ کر سکا۔ الیکشن سے میرا اتفاق نہیں تھا اپنی جماعت کے لیے کام کرتا رہا اور ملک میں تابڑ توڑ دورے کرتا رہا اور حکومت کے پرزوں کا میں خوب اچھی طرح سے مطالعہ بھی کر رہا تھا۔ حکومت ہماری مخالفت میں مشغول تھی۔ لیکن مجھے اس بات کا پتہ لگا کہ حکومت نے اسلامیہ کالج پشاور اور اسی طرح کے سکول کالج صوبہ سرحد بھر میں کیا ہے اور انگریزوں کی بیویاں بھی میں نے دیکھ لیں کہ وہ گھوم رہی ہیں اور لوگوں سے کہہ رہی تھیں کہ ''ہم آپ کے پاس آئی ہیں ہمیں دوپٹہ دان دیجیے اور ہمارا دوپٹہ ووٹ ہے'' الیکشن کے پروپیگنڈے کے لیے بیگم شاہنواز کی لڑکی بھی دوسری کئی لڑکیاں اپنے ساتھ لے کر پنجاب سے سرحد میں آ گئی

تھی۔اور پنجاب کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء،کلکتہ کے اسلامیہ کالج کے لڑکے اور ہندوستان کے دیگر مقامات کے کارکن اور لیگی رہنما بڑی بھاری تعداد میں صوبہ سرحد میں پہنچ گئے تھے۔اس کے علاوہ حکومت اور مسلم لیگ نے پنجاب اور سرحد کے گدی نشین پرہیز گار سب کوکوٹھریوں سے نکال کر الیکشن کے میدان میں جھونک دیا تھا۔وہ ہمارے مقابلے میں کھڑے کر دیے گئے تھے۔میں نے جب انگریزوں اور ان کی میموں کی طرف سے مسلم لیگ کے الیکشن میں اتنی جدوجہد دیکھی تو میرا خیال بدل گیا۔الیکشن میں صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا کہ میں نے الیکشن کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔یہ الیکشن متحدہ ہند کے عام آخری انتخابات ۴۶۔۱۹۴۵ء ہندوستان اور پاکستان کے مسئلہ پر تھا۔ہندو اور مسلمان کے سوال پر مندر اور مسجد اور اسلام وکفر کے نام پر تھا۔ مسلم لیگی لوگوں سے کہتے تھے کہ مسجد کو ووٹ دیتے ہو یا مندر کو؟ ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کی طرح پٹھان دقیانوسی خیالات کے نہیں تھے۔ان میں سیاسی شعور موجود تھا۔انہیں سوجھ بوجھ حاصل تھی کہ انہیں کوئی اسلام کے نام پر دھوکہ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ وہ اسلام سے بخوبی واقف تھے۔اوراس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ صوبہ سرحد میں ایک قومی تحریک تھی اوراس تحریک نے ملک وملت کے لیے بڑی قربانیاں اور شاندار خدمات سرانجام دی تھیں باقی ہندوستان کے مسلمانون میں نہ تو کوئی قومی تحریک تھی اور نہ ہی کسی نے ایسی قومی تحریک میں کوئی ایسا کام کیا تھا۔

ووٹوں کے وقت حکومت نے مسلم لیگ کے لیے بہت کوشش کی اور خدائی خدمت گاروں کی بڑی سخت مخالفت کی،لیکن خدا کے فضل سے مسلم لیگ نے شکست

کائی اور ہم لوگ بڑی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

حکومت اور اس کے کل پرزوں نے ہمارے خلا بڑا سخت کام کیا تھا اس قدر کام اور پروپیگنڈہ خود مسلم لیگیوں نے نہیں کیا تھا حکومت کا یہ کام ہمیں بڑا مکروہ دکھائی دیتا تھا ہم نے صلاح ومشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ہم وزارت نہیں بنائیں گے اور ہم نے وزارت بنانے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ ہم تب تک وزارت بنانے کے لیے تیار نہیں جب تک حکومت ہمیں یہ اجازت نہ دے دے کہ جن سرکاری ملازموں نے الیکشن میں ہمارے خلاف حصہ لیا ہے اور ملازمت کے قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کی ہے ان پر ہم مقدمے چلائیں اور مجرموں کو مناسب سزائیں دیں ہمارے اس فیصلے کی خبر جونہی ڈاکٹر صاحب کو ملی انہوں نے اس سے سردار پٹیل کو آگاہ کر دیا کیونکہ ان کی یہ رائے تھی کہ وزارت قائم کر لینی چاہیے۔

سردار پٹیل نے مولانا عبدالکلام آزاد کو اس مسئلہ کے حل کے لیے سرحد بھیج دیا اور ہماری پشاور میں میٹنگ ہوئی۔ہم نے مولانا صاحب سے صاف صاف الفاظ میں یہ بات کہہ دی کہ جن لوگوں نے بے ایمانی کی ہے ان کے بارے میں جب تک حکومت ہماری شرط نہ مان لے اس وقت تک ہم وزارت نہیں بنائیں گے۔ مولانا صاحب واپس دہلی چلے گئے اور وہاں سے وائسرائے ہند سے ایک خط لے کر پھر صوبہ سرحد آ گئے۔اس خط میں وائسرائے نے کچھ گول مول طریقے سے ہماری شرط مان لی تھی۔اب ہم نے اپنے ساتھیوں سے صلاح ومشورے کر کے اس شرط پر وزارت بنا لی کہ اختیارات ایک مرکزی کمیٹی کے ہاتھ میں رہیں گے۔

ریفرنڈم اور کانگریس کی بے رخی

جولائی ۱۹۴۶ میں ہندوستان کے لیے آئین بنانے کی غرض سے میں اور مولانا ابوالکلام آزاد خدائی خدمت گاروں اور فرنٹئر اسمبلی کی طرف سے آئین ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ ہمارے صوبے کے تین ممبر تھے۔ دو تو ہم تھے اور تیسرا ممبر ضلع ہزارہ کا باشندہ تھا الیکشن میں صرف یہی ضلع ہزارہ تھا جس میں مسلم لیگ کو ووٹ ملے تھے۔ اور مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔ الیکشن میں اس قدر واضح اکثریت حاصل کرکے جس میں واضح مسائل پر ہم نے مقابلہ کیا تھا اور ایسے حالات میں جبکہ مسلم لیگ کو حکومت کی بھی پشت پناہی حاصل تھی اور ہندوستان کے تمام مسلم لیگی لیڈر اور ساری طاقت اور چالاکی ہمارے خلاف استعمال کی گئی تھی ہماری کامیابی کا مطلب اس سے سوا اور کیا نکلتا ہے کہ ملک کی اکثریت ہماری پشت پر کھڑی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب ہماری نمائندگی کے سلسلے میں صوبہ سرحد میں پھر سے ریفرنڈم کا حکم ہم پر ٹھونس دیا گیا تو ہمیں قدرتی طور پر اس صریح ظلم کے خلاف غصہ آیا۔ اور ہم نے ریفرنڈم میں حصہ نہ لینے اور اس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کای۔ تاکہ دنیا کو ہمارے قہر غصے اور ہمارے ساتھ کی گئی بے انصافی کا علم ہو جائے۔

وائسرائے کا یہ حکم نہ صرف منطق اور دلیل کے خلاف تھا بلکہ ایک امتیازی یا استثنائی سلوک بھی تھا جو پشتونوں سے انگریزوں نے جاتے وقت روا رکھا تھا۔ جسے

ہم ہرگز برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ جہاں سارے ہندوستان میں ایک صوبے کے ان نمائندوں سے جو اسمبلی میں موجود تھے پوچھا گیا کہ آیا وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں جانا چاہتے ہیں وہاں صوبہ سرحد کی اسمبلی کو یہ حق نہیں دیا گیا۔صوبہ سرحد کی اسمبلی اور اس اسمبلی کے ممبروں کی نمائندگی اور نمائندہ کی حیثیت کو انگریزوں نے پس پشت ڈال دیا یہ پشتونوں کو پوری ملت کی بے حرمتی تھی جسے ہم کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔

مجھے افسوس اور دکھ اس بات سے ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی ہمارے لیے کوئی غیرت نہ کھائی اور ہماری حقیر سی امداد کے لیے بھی جس کی ہمیں ان سے توقع تھی ہمارے آڑے نہ آئی۔ اس نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہمیں دشمنوں کے حوالے کر دیا حالانکہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی سنگ دلی بے رخی اور بے حسی آسام کے صوبے کے حق میں ایسی نہیں تھی جبکہ وہاں کے وزیراعظم گوپی ناتھ باردولائی نے گروپ بندی ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ پس لارنس پلان ۱۹۴۶ء اور شور مچا تھا۔ باردولائی کی چیخ و پکار اور شور کی وجہ سے کانگریس اس بات پر اڑ گئی تھی اور گروپ بندی کی وہ سکیم نہیں مانی تھی۔ حالانکہ میں اس کا مخالف نہیں تھا۔ جب مجھ سے گاندھی جی نے دریافت کیا تو میں نے انہیں کہہ دیا کہ تقسیم کی بجائے ہر ایک سکیم اچھی ہے اس حال میں اور ایسے سلوک کے بعد پٹھان کی حیثیت سے ہمیں یہ پوچھنا بے محل تھا کہ آیا ہم ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں جانا چاہتے ہیں۔ چونکہ کانگریس نے جو ہندوستان کی نمائندہ جماعت تھی ہمیں نہ صرف اپنے سے

دور ہی پھینک دیا تھا۔ بلکہ ہمیں دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا۔ ان سے ملنا تو ہماری پٹھانی غیرت اور اخلاقیات و روایات کے لیے ایک طرح کی موت تھی۔ رہ گیا پاکستان کا مسئلہ تو اس مسئلے کو ہم نے مسلم لیگ کے مقابلے میں الیکشن لڑا تھا تو پھر ہمیں نئے سرے سے سر دردی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے اسی وجہ سے مطالبہ کیا کہ ہمارے سامنے اگر کوئی ریفرنڈم کرانے کی تجویز رکھتا ہے تو بسم اللہ وہ میدان میں نکل آئے اور پشتونستان اور پاکستان کے موضوع پر ریفرنڈم کرالیا جائے۔

ہمارے اس مطالبے پر بھی کسی نے کان نہیں دھرے ہم پر ریفرنڈم ٹھونس دیا گیا چونکہ ہم ریفرنڈم میں حصہ نہیں لے رہے تھے لہٰذا مسلم لیگ نے میدان صاف کر لیا۔ ان سے جو چالاکی فریب اور زور زبردستی ہو سکتی تھی وہ انہوں نے کی لیکن پھر بھی وہ ایک سو میں سے پچاس اعشاریہ ایک ووٹ ہی مر مر کر لے سکی جو ایک ملت کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی وجہ سے کافی نہیں تھے۔ انگریزوں نے نہ صرف ایک دیانت دار حکومت کی مانند اپنے آپ کو اس ریفرنڈم میں غیر جانبدار رکھا بلکہ انہوں نے خود براہ راست ووٹوں میں اپنے پولیس اور فوج کے ذریعے حصہ لیا اور اپنی فوج اور پولیس کے ملازم جوق در جوق پولنگ سٹیشنوں پر بھیجے کہ وہ ان لوگوں کے نام جعلی ووٹ ڈالیں جنہوں نے ریفرنڈم میں حصہ نہیں لیا تھا۔

اس سلسلے میں میرے ایک جیل خان کے ساتھی کرنل بشیر نے ہری پور ہزارہ کے سنٹرل جیل میں ۱۹۸۵ء میں مجھے ایک داستان سنائی جبکہ وہ فوج میں تھا۔ اور اس کی کمپنی بنوں کے قریب لتمر میں تعینات تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ تین مرتبہ اسی کمپنی اور

اس کے نوجوانوں کو پولنگ سٹیشن پر لے گیا تھا تا کہ پاکستان کے حق میں ان سے جعلی ووٹ ڈلوائے۔ کرنل بشیر کو بعد میں محکمہ انٹیلی جنس میں ایک بڑا افسر مقرر کر دیا گیا تھا۔ جو آخر میں پنشن یافتہ ہو گیا تھا۔ ایک جرم میں دو سال کی قید کی سزا ہوئی تھی۔ اور وہ میرے ساتھ ایک ہی جیل میں رہتا تھا۔

سرحد کے ریفرنڈم کے سلسلے میں لاکھوں کی تعداد میں سرخ پوشوں یعنی خدائی خدمت گاروں کے ووٹ سرکاری ملازموں اور ان کے خوشہ چینوں یعنی مسلم لیگیوں نے جعلی طور پر بھگتائے تھے۔ کیونکہ سرخ پوشوں نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ چنانچہ خان امیر محمد خان کا جعلی ووٹ بھی ایسے ووٹوں میں شامل ہوا تھا۔ اور میرا جو اندیشہ تھا وہ درست ثابت ہوا۔

پاکستان کی اٹھارہ سالہ زندگی میں مجھے پندرہ سال جیل خانوں میں رکھا گیا اور پھر ایسی قید میں جو خدا کسی کو نہ دکھائے آمین...... اس عرصے میں ہزاروں کی تعداد میں خدائی خدمت گار موت کے گھاٹ اتار دیے گئے قید و بند میں مبتلا رکھے گئے۔ اور ان کے ساتھ ایسے ناروا سلوک ہوئے ہیں اور ان پر ایسے مظالم توڑے گئے ہیں جنہیں انسانیت برداشت نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کا مسلم لیگ نے بائیکاٹ کیا تھا۔ میں نے مسلمان ممبروں سے اس مسئلے پر بڑی بحث کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ آیئے آئین ساز اسمبلی میں چلے جائیں گے اور اس میں یہ تجویز پیش کر دیں گے کہ ہندوستان میں سوشلسٹ جمہوریت قائم کرنا چاہیے۔ نیز اگر ہندوؤں نے ہماری یہ بات مان لی

تو ہم فیڈریشن میں رہ جائیں گے اور اگر انہوں نے ہماری یہ بات نہ مانی تو ہم اپنے اپنے صوبوں میں فیڈریشن سے جدا ہونے کی تجویز منظور کر لیں گے ۔ یہ حق ہمیں حاصل ہے کہ فیڈریشن سے جدا ہو جائیں اور کہ ہمارا صوبہ ایک خود مختار ریاست بن جائے لیکن مسلمانوں پر ایک ایسی چال چلائی گئی تھی کہ وہ کسی قسم کی بات پر غور و فکر کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے اور مجھے تو یہ ایک مستقل جواب دیتے تھے کہ ''تم ہندو ہو''۔

☆☆☆

کیبنٹ مشن اور ہندوستان کی عبوری حکومت

اس دوران لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند کی رہنمائی میں ایک کیبنٹ مشن آیا تھا اور کانگریس کے اس ڈیلی گیشن کا جوان سے بات چیت کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ ہم چار آدمی کانگریس کے تھے ابوالکلام آزاد' جواہر لال نہرو سردار پٹیل اور میں...... اور چار آدمی مسلم لیگ کے تھے جناح 'لیاقت علی خاں۔ نواب اسماعیل اور عبدالرب نشتر...... بات چیت شملہ میں شروع ہوئی۔ دوسرے دن بات چیت کے بارے میں ہم نے یہ کہا کہ سب سے پہلے آپ لوگ کیبنٹ کے ممبروں سے یہ فیصلہ کریں کہ آیا وہ ہندوستان کو آزاد کرنے سے پہلے آپ لوگ کیبنٹ ممبروں سے یہ فیصلہ کریں کہ آیا وہ ہندوستان کو آزاد کرنے اور اپنی فوجیں ہندوستان سے نکالنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟ ایسا نہ ہو کہ آپ لوگوں سے دوسری باتوں میں اصلی مطلب گول مال ہو جائے۔

دوسرے دن جب ہم گفت وشنید کرنے کے لیے گئے اور اجلاس شروع ہوا تو جواہر لال نے یہ دونوں باتیں پیش کر دیں۔ وائسرائے لارڈ ویول نے پنڈت جی سے کہا ''ہم تو ہندوستان چھوڑتے ہیں لیکن یہ تو بتائیے کہ کس کے حوالے کریں؟ ......آپ لوگ آپس میں فیصلہ کرلیں۔

اس بات کا اثر مسٹر جناح پر بھی ہوا اور انہوں نے کہہ دیا کہ اچھی بات ہے ہم گھر میں فیصلہ کرلیں گے۔ اجلاس ملتوی ہوگیا۔ جناح صاحب اور جواہر لال اٹھ کھڑے

ہوئے اورایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ایک دو گھنٹے کے بعد باہر آنے کا فیصلہ اس بات پر ہوا کہ تین آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی جائے جس کیلیے ایک ممبر کانگریس منتخب کرے۔ایک مسلم لیگ۔اوران دونوں کا سرپنچ دونوں کے اتفاق رائے سے مقرر کیا جائے۔جو فیصلے ہم آپس میں متفقہ طور پر کریں گے وہ توٹھیک ہو ں گے......اورجن باتوں میں ہمارا اختلاف پیدا ہو جائے گا ان کا فیصلہ تین آدمیوں کی یہ کمیٹی کرے گی۔

اس کمیٹی کے ممبران کو منتخب کرنے کے دو دن مقرر کر دیے گئے۔تیسرے دن جب ہم آپس میں اکٹھے ہو گئے اور لارڈ پیتھک لارنس نے جو نہایت شریف انگریز تھا جب جناح صاحب سے پوچھا تو جناح صاحب اس سارے فیصلے سے ہی منکر ہو گئے۔اس وقت میں نے نشتر صاحب کو اشارہ کیا وہ میرے پاس آ گئے۔میں نے ان سے کہا کہ جناح صاحب سے کہیے کہ وہ کھیل کو نہ بگاڑیں کیونکہ گاندھی جی نے میرے سامنے میرے ساتھیوں سے کہا ہے کہ مسلمان جو کچھ بھی مانگیں انہیں دے دو۔لیکن فیصلہ اتفاق رائے سے کرلو۔

نشتر صاحب چلے گئے اور جناح صاحب کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔لیکن جناح صاحب نے ان کی طرف کوئی دھیان ہی نہ دیا۔نشتر صاحب کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے ارو سارا معاملہ کھٹری ہو گیا۔حقیقت یہ تھی کہ انگریز ہندو مسلم اتحاد و اتفاق نہیں چاہتے تھے اور ہندوستان کو تقسیم کرنے پر تلے ہوئے تھے جب کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان باہمی فیصلہ نہ ہو سکا تو کیبنٹ مشن نے

اپنا فیصلہ دے دیا اور اپنے فیصلے کا اعلان کر کے مشن واپس چلا گیا۔ اور وائسرائے ہندوستان کی عبوری حکومت قائم کر لی اور انگلستان کی پارلیمنٹ کا یہ اعلان کر دیا کہ چھ مہینے کے بعد ہم ہندوستان خالی کر دیں گے۔ بعض اختلافات کی بناء پر کانگریس نے عبوری حکومت بنانے کا انکار کر دیا تھا۔ مسلم لیگ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کانگریس نے حکومت قائم نہ کی تو مسلم لیگ کر لیے گی لیکن وائسرائے نے مسلم لیگ کی یہ تجویز نہ مانی۔ کانگریس نے عبوری حکومت بنالی۔ جب یہ گورنمنٹ قائم ہوگئی تو میں نے جواہر لال نہرو سے کہا ''صوبہ سرحد میں ان قبائلیوں پر کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں دراصل وہ روپیہ خود انگریز قبائل کے سردار ملک اور نوکر چاکر کھا جاتے ہیں۔ صوبہ اور اس کے باشندے اس سے بالکل محروم رہ جاتے ہیں اس طرح اس قدر بھاری بھر کم خرچ کے باوجود ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ اب جبکہ اختیار ہمارے ہاتھ میں آ گیا ہے تو آپ یہ علاقہ بچشم خود دیکھ لیں۔ ان لوگوں سے مل لیں۔ یہ لوگ بڑے عاجز اور مظلوم ہیں اور ان کا ملک اکثر پہاڑ ہی پہاڑ ہے اور اگر تھوڑا سا احسان ان کے ساتھ بھی ہو جائے اور ان کی ''قوت لایموت'' کے واسطے کو ذریعہ پیدا ہو جائے اور انکے بچوں کی تعلیم کے لیے انتظام ہو جائے تو اس کا ان لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑے گا ارو یہ گڑ بڑ جو کبھی کبھار ہو جایا کرتی ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

☆☆☆

نہرو کی صوبہ سرحد آمد

جواہر لال کو میں نے اس بات پر راضی کر لیا اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ وہ صوبہ سرحد میں آئیں گے اور ضرور ان لوگوں اور ان کا علاقہ دیکھیں گے۔ اور جس قدر بھی اس سے ہو سکے گا وہ ان لوگوں کے لیے کریں گے۔ لیکن جب وقت جواہر لال نہرو نے سرحد جانے کا ارادہ کیا تو وائسرائے نے اس کی مخالفت کی اور انہیں قبائلی علاقے میں جانے سے منع کر دیا۔ پنڈت نہرو نے وائسرائے سے کہا کہ انہوں نے اس علاقے میں جانے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس لیے وہ ضرور جانا چاہتے ہیں۔

وائسرائے سمجھ گئے کہ نہرو ٹلنے والا انسان نہیں تو انہوں نے نہرو کے ارادے کی مخالفت تو ترک کر دی لیکن ان کے پیچھے گورنر سرحد کو لگا دیا۔ اس وقت سرحد کا گورنر اولف کیرو تھا۔ وہ مسلم لیگ کا حمایتی تھا۔ وہ پنڈت نہرو سے ملنے کے لیے دہلی گیا اور ان کے پاس تین دن اور تین راتیں ٹھہرا۔ لیکن اس نے نہرو جی کی اس بات سے اتفاق نہ کیا۔

دہلی سے واپس آ کر گورنر سر والف کیرو نے تمام پولیٹکل ایجنٹوں کو ہمارے خلاف بری طرح بھڑکا دیا۔ جب نہرو جی صوبہ سرحد میں تشریف لائے تو ہم نے قبائلی علاقہ کا دورہ شروع کر دیا۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہمارے لیے کتنی مشکلات پیدا کی گئی ہیں اور وہ سب مشکلات جو ہمارے راستے میں حائل تھیں سب گورنر کیرو کی پیدا کی ہوئی تھیں۔ ہم نے پہلے پہل اپنا دورہ وزیرستان سے شروع کیا۔ وزیرستان کے تمام پولیٹکل ایجنٹ انگریز تھے۔ ان میں اتنی شرافت تھی کہ انہوں نے ہمارا مقابلہ شریفانہ

طریقے سے کیا۔انہوں نے یہ کیا کہ جس وقت میران شاہ میں جرگہ شروع ہو گیا اور ہم نے جرگے کو مخاطب کیا تو جرگہ اٹھ کھڑا ہوا جرگے نے یہ بات کہی کہ وہ ہندوؤں کی حکومت نہیں چاہتے ۔اور جب ہم میران شاہ سے زرمک پہنچے تو وہاں بھی صرف یہی کچھ ہوا۔پھر وہاں سے ہم وانا گئے تو وہاں بھی یہی کچھ ہوا۔پھر جب ہم لوگ وہاں سے دوبارہ میران شاہ آئے تو ان تمام پولیٹکل ایجنٹوں سے جن کے ساتھ ریذیڈنٹ بھی موجود تھا جواہر لال نہرو نے پوچھا کہ یہ کروڑوں روپے ملک پر خرچ ہو رہے ہیں اس روپے سے آپ لوگوں نے لوگوں کے لیے کیا کیا ہے؟......ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے پٹھانوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے انگریز میری اس بات پر قدرے خوش ہو گئے ۔لیکن جونہی اپنی اس بات کے بعد میں نے یہ بات کہی کہ انہوں نے پشتونوں کو اس قدر پست ہمت اور بزدل کر دیا ہے اور ان کو اتنا زیر دست بنا دیا ہے کہ اگر پٹھان کو پیسہ دکھلا دو تو چاہے ان کا ملک ' اسلام اور قوم سب کچھ دریا برد ہو جائیں ' انہیں ان چیزوں کی فکر نہیں ہوتی ۔وہ کہتے ہیں کہ ان کی بلا سے یہ سب کچھ جائے ڈوب جائے لیکن ان کے پیسے بن جائیں۔

میری یہ بات سن کر وہ انگریز جو میری پہلی بات سے خوش ہو گئے تھے بہت خفا ہو گئے چنانچہ جس وقت ہم سب کھانا کھانے بیٹھے تو وانا کے ایک نوجوان پولیٹکل ایجنٹ نے مجھ سے پوچھا ''کیا واقعی ہم نے اس ملک کے لیے کچھ نہیں کیا؟''

میں نے اسے جواب دیا ''بخدا کچھ بھی نہیں کیا ہے ۔اور اگر کہیں کچھ کیا ہے تو وہ

مجھے دکھا دو"

میرے اس جواب سے اس پر کیا گزری ہوگی۔ اس پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں اور ہمیں فرصت بھی نہیں تھی کہ ہم وہاں سے ٹانک چلے گئے اور ٹانک سے جنڈ چوالہ گئے اس جگہ کا پولیٹکل ایجنٹ ایک ہندو تھا جس کا نام دیوان شوسرن لال تھا یہاں قبائلیوں نے ہمارا بڑا شاندار استقبال کیا ہمارے پاس دنبے' بترے لے آئے اور ہمارے اور ان کے درمیان جتنی باتیں ہوئیں انہوں نے سب باتوں کی تائید کی اور ان سے اتفاق بھی ظاہر کیا۔ پھر جب ہم جنڈولہ کی طرف جا رہے تھے تو جگہ بہ جگہ قبائلی ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے تھے اس جگہ سے چل کر ہم لوگ واپس پشاور آ گئے۔

دوسرے دن ہم خیبر چلے گئے اس جگہ کا پولیٹکل ایجنٹ مسلمان تھا۔ صاحبزادہ خورشید اس کا نام تھا جب پہلے پہل ہمارا قافلہ جمرود پہنچا تو سڑک سے تھوڑے فاصلے پر آفریدی بیٹھے ہوئے تے ارانہوں نے ہاتھوں میں جوتیاں لی ہوئی تھیں اور ان جوتیوں کو ہماری طرف کر کے ہلا رہے تھے پھر ہم لوگ طورخم تک چلے گئے اب پاک افغان سرحد ہے ترخم مین جب چائے پینے کے بعد ہم لوگ لنڈی کوتل پہنچے تو لوگ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور ہم پر پتھر برسا رہے تھے۔ پولیٹکل ایجنٹ کی موٹر ہم سے آگے تھی۔ اسنے فوراً اپنی موٹر ٹھہرا لی اور وہ موٹر سے اتر پڑا۔ سپاہی اس کے ساتھ تھے۔ ان لوگوں پر بندوقیں چلا دی گئیں اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ پتھراؤ سے ہماری موٹر کے شیشے ٹوٹ گئے لیکن ہم میں سے کسی کو کوئی چوٹ

نہ آئی اور نہ ہی ہم میں سے کسی کو پتھر لگا۔ صرف ہمارے ساتھ ایک انگریز تھا۔ وہ اتر گیا تھا کیونکہ تصویر فوٹو لینا چاہتا تھا اسے ایک پتھر ضرور لگا تھا۔

ہمارا دوسرے دن کا دورہ مالاکنڈ ایجنسی کے لیے تھا۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ مالاکنڈ کا پولیٹکل ایجنٹ پشاور سے آیا تھا اس نے گورنر سے ملاقات کی تھی۔ یہ آدمی انگریزوں کا ایک بہت بڑا بے ضمیر ایجنٹ تھا اس پر کمینہ پن ختم تھا۔ اس کا نام شیخ محبوب علی تھا اسی شیخ محبوب علی کے ہاتھوں ہماری قوم نے بڑی تکالیف اور روحانی عذاب اٹھائے ہیں اور وہ آدمی ہے جو کابل میں برطانوی سفیر ڈیوڈ ہیمفری کی چاکری میں اس لیے نام پیدا کر چکا تھا کہ افغانستان میں امان اللہ خان کی حکومت کا تختہ الٹنے اور بچہ ثقہ کو برسر اقتدار لانے میں سرگرم رہا تھا ہمارے ساتھ جو ناخوشگوار سانحے ہوئے اسی کے طفیل تھے۔

ان واقعات میں ایک واقعہ مالاکنڈ کا بھی تھا۔

انسان غرور نخوت میں خدا کو بھول جاتا ہے اور زعم میں نہ جانے کیا کچھ کر بیٹھتا ہے۔ لیکن خدا کی لاٹھی بے آواز اور قہر و غضب کو نہیں بھولنا چاہیے۔ دنیا جانتی ہے کہ آج اسی محبوب علی کے گھر میں گدھے رینگ رہے ہیں۔ آخری زندگی میں وہ اس قدر بے عزت اور غمزدہ ہوا کہ اسکی حالت دیکھ کر سنگدل انسان کا دل بھی پارہ پارہ ہو جاتا تھا۔ اس کے گھر میں صرف دو لڑکیاں اور ایک عورت تھی۔ اس کی ایک لڑکے کو اس کے بھتیجے نے اس کے گھر کے اندر اس کے سامنے ہی پستول سے اڑا دیا۔ دوسری لڑکی اپنی موت آپ مر گئی اور اس کی عورت اس کا سارا مال و متاع لے کر بھاگ گئی

۔آج ملک میں اس کا کوئی نام ونشان بھی باقی نہیں ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے نہ کوئی گھر ور ہے اور نہ ہی نام ناموس ہے۔اور خود بھی خدا کو حساب دینے کے لیے دنیا سے اٹھ چکا ہے۔

تو شب رابسر کے می بری اے شمع کم فرصت
گرفتم سوختی پروانہ آتش پہ جائے را

ہاں تو مالاکنڈ ایجنسی کا پولیٹکل ایجنٹ یہی شیخ محبوب علی تھا۔ میں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے پوچھا کہ مالاکنڈ جائیں گے؟ انہوں نے کہا کہ اپنا پروگرام تو نہیں چھوڑیں گے۔ وزیرستان میں تو ہمارے ساتھ فوج تھی لیکن جب خیبر جارہے تھے تو فوج نہیں تھی پولی تھی میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ہم مالاکنڈ جائیں گے لہذا فوج کا کچھ انتظام کیجیے اور اگر آپ فوج کا انتظام نہیں کر سکتے تو ہم اپنے خدائی خدمت گاروں کا انتظام کر لیتے ہیں۔ اور دیکھیے کہ پولیس کا یہ موجودہ انتظام ہرگز منظور مت کیجیے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا ''بہت اچھا...... میں ضرور فوج کا انتظام کروں گا''۔لیکن جب ہم رسالپور میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی پولیس کھڑی ہے۔ اسے دیکھتے ہی میں بہت خفا ہوا۔ ایک دفعہ تو میں نے ارادہ کیا کہ میں ان جواہر لال ڈاکٹر خان صاحب اینڈ پارٹی کے ساتھ بالکل نہ جاؤں۔ پھر میں سوچا کہ جواہر لال میری خاطر ہی تو آئے ہیں لہذا میں انہیں اکیلا تو نہیں چھوڑوں گا۔لہذا مجبوراً میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ ہم مالاکنڈ میں اپنے مقررہ وقت سے پہلے پہنچ گئے تھے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ جب ہم قلعے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو اسی اثناء میں ہم نے کچھ نعرے

سنے کی یہ شیخ کا لشکر ہے اور اسی کے مطابق آیا ہے جو اسے بتایا گیا تھا۔لیکن ہم تو ان کی آمد سے پیشتر پہنچ گئے تھے۔

اسی ایجنسی مالاکنڈ میں بھی ہمارے خدائی خدمت گار تھے راحت خاں ہمارا ایک ممتاز کارکن رات کو ہمارے پاس آیا۔اس نے اطلاع دی کہ شیخ محبوب علی نے بہت سے لوگ بلائے ہیں لہذا آپ لوگوں کو بہت احتیاط اور غور و خوض سے کام لیں۔ہم نے رات تو مالاکنڈ میں گزاردی شیخ محبوب علی ہمارے ڈاکٹر خان صاحب کی بہت خوشامد اور چاپلوسی کرتا تھا۔اور ڈاکٹر صاحب کی یہی کمزوری تھی کہ وہ خوشامد اور چاپلوسی کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تھے۔صبح صادق نمودار ہوئی اور ہمارے روانہ ہونے کا وقت ہونے لگا تو میرے پاس ایک خدائی خدمت گار آیا اور اس نے خبر دی کہ ہم لوگوں کے آگے بہت سے لوگ راستے میں کھڑے کیے گئے ہیں لہذا روانہ ہونے سے پہلے ہمیں اپنا انتظام کرلینا چاہیے۔میں نے ڈاکٹر خان صاحب کو علیحدہ کر کے یہ بات کہہ دی۔

شیخ دور کھڑا تھا اور ہمیں دیکھ رہا تھا۔پھر وہ آہستہ سے ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا اور ان سے دریافت کرنے لگا کہ کیا بات ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے اسے حالات سے آگاہ کیا تو اس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا'' کیا آپ میرے باپ نہیں ہیں۔میں پشتون نہیں ہوں کیا؟ میں ایسا حرامی ہوں کہ آپ سے غلط برتاؤ کروں گا؟''

ڈاکٹر صاحب نے ہم سے کہا کہ چلو چلیں۔ڈاکٹر صاحب نے شیخ کے بھروسے میں آکر پولیس گارڈ کا انتظام بھی نہ کیا اور چل پڑے۔شیخ آگے آگے جا رہا تھا اور ہم

اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔قلعہ کے دروازے میں انگریز جواہر لال نہرو کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ہم نے موٹر روک لی ۔انہوں نے جواہرلال سے خدا حافظ کہا۔اس اثناء میں شیخ محبوب علی وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ہ قلعے سے باہر نکلے ور انگریزوں سے تھوڑا اس طرف ہوئے تو لوگ کھڑے تھے اور انہوں نے ہم پر پتھروں کا مینہ برسانا شروع کر دیا۔انہوں نے سڑک پر لاری کھڑی کر رکھی تھی اور سڑک بند کر رکھی تھی۔ہم پر پتھر برس رہے تھے۔ایک پتھر میری پیٹھ میں لگا۔میں قدرے بے ہوش ہو گیا اور ہمارے ساتھ ایک جمعدار موٹر میں آگے بیٹھا ہوا تھا۔وہ پتھروں سے بچنے کے لیے سیٹ پر جھک گیا۔اس کے پاس پستول تھا ل جس پر ڈاکٹر صاحب کی نظر جا پڑی۔ڈاکٹر صاحب نے وہ پستول اس کے تاش سے باہر کھینچ لیا۔ اور موٹر سے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور جو لوگ ہمیں پتھر مار رہے تھے انہیں آواز دی کہ وہ ہٹ جائیں اور باز رہیں ورنہ گولی چلا دی جائے گی۔لوگوں نے پستول دیکھا تو ہٹ کر دور چلے گئے۔آگے لاری کھڑی تھی ڈاکٹر صاحب نے وہی پستول ڈرائیور کو دکھایا اور بولے ''راستہ چھوڑ دو ورنہ ابھی تمہیں جہنم رسید کرتا ہوں''۔

ڈرائیور نے بھی لاری کے راستے سے ہٹ گیا۔اس طرح ہم اس مصیبت سے بچ گئے ہمیں قلعے کے دروازے کے اندر پتھر مارے گئے۔انگریز ہمیں پٹتے دیکھ رہے تھے اور کچھ نہیں کرتے تھے۔حالانکہ ہمارے ساتھ مرکزی حکومت کے بڑے وزیر جواہرلال تھے جن کے ہاتھ میں قبائلی علاقے کی باگ ڈور تھی اور صوبہ سرحد کے وزیر اعظم اترے اور ٹھہر گئے کیونکہ ہماری موٹر کے شیشے ٹوٹ گئے تھے اور ہم زخمی

ہو گئے تھے ۔ ہم لوگ موٹر سے اتر پڑے ۔ اتنے میں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری گاڈ ہمارے سامنے آ گئی ہے ۔ مردان کا ڈپٹی کمشنر جس کا نام کرٹس تھا وہ ہماری گارڈ کا انچارج تھا اور اسے حکومت نے ہماری حفاظت کے لیے مقرر کیا تھا وہ ہمارے پاس آیا اور ڈاکٹر صاحب کے آگے کچھ عذر معذرت کرنے لگا ۔ حالانکہ وہ شیخ باہمی صلاح ومشورے سے یہ سب کچھ کر رہے تھے ۔

جب ہم اس جگہ سے روانہ ہو رہے تھے تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ اپنی گارڈ کو حکم دیں کہ ان کی ایک لاری ہم سے آگے رہے اور دوسری ہمارے پیچھے چلے اور جب سڑک پر آدمیوں کو دیکھے تو آگے والی لاری ٹھہر جائے سپاہی نیچے اتر جائیں اور ان لوگوں کو منتشر کر دیں اور اگر منتشر نہ ہوں تو ان پر لاٹھی چارج کریں اور اگر پھر بھی منتشر نہ ہوں تو ان پر یہ دوسری لاریاں گولی چلا دیں ۔ خیر جب ہم مالا کنڈ سے نیچے اتر گئے اور درگئی میں پہنچ گئے تو پھر راستے میں لوگ کھڑے تھے ۔ اور انہوں نے ہمیں پتھر مارے ایک پتھر جو ایک آدمی نے جواہر کی طرف پھینکا تھا میں نے اپنے ہاتھ پر جھیل لیا ۔ اور جواہر لال بچ گئے مگر میرا ہاتھ ٹوٹ گیا ۔ ایک آدمی نے گندگی کی ایک ہانڈی اٹھائی ہوئی تھی ۔ اس نے وہ ہانڈی موٹر پر دے ماری میں اور جواہر لال تو دونوں بچ گئے لیکن ڈاکٹر صاحب گندگی سے لت پت ہو گئے ۔

ہم مصیبت سے پشاور پہنچے ۔ وہ ساری مصیبت ڈاکٹر صاحب کے کارن دیکھنے کو ملی ۔ اگر انہوں نے ہمیں اپنا انتظام کرنے دیا ہوتا تو ہم اپنا انتظام بخوبی سے کر سکتے تھے ۔ دوسرے دن ہمارے مرکز میں جلسہ تھا ۔ ہم نے وہاں ایسا انتظام کیا کہ

حکومت کی سازش کے باوجود کسی کو اتنی جرات نہ ہوئی کہ ہمارے یا ہمارے جلسے کے نزدیک بھی پھٹکتا۔

دوسرے دن ہم نے ڈاکٹر خاں صاحب کو کہلا بھیجا کہ ہم نے اپنا انتظام کر لیا ہے ہمیں آپ کی اور آپ کی حکومت کے انتظام کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ہم نے اپنا سارا انتظام مکمل کر لیا اور میں اور جواہر لال کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا تو مجھے اطلاع ملی کہ آج بہت سے انگریز ڈاکٹر صاحب کے بنگلے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ فوج کا انتظام کر رہے ہیں۔ اتنے میں خود ڈاکٹر صاحب ہمارے پاس آ گئے اور میں نے انہیں کہا۔ ان انگریزوں کو اب رخصت کیجیے ہمیں ان کی اور ان کی فوج کی ضرورت نہیں۔ آج ہم نے اپنا انتظام خود کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا " جانے دیجیے کوئی ہرج نہیں انہیں انتظام کرنے دیجیے "۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا کہ میں انہیں ہرگز نہیں آنے دوں گا اور میں خود باہر چلا گیا۔ اور انگریزوں سے کہہ دیا کہ جب ہمیں ان کی طرف سے حفاظت اور انتظام کی ضرورت تھی تو ان لوگوں نے ہماری وہ ضرورت پوری نہ کی۔ آج ہمیں ان کی اور ان کے انتظام کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اپنا انتظام خود کر لیا ہے۔ وہ مہربانی فرمائیں اور تشریف لے جائیں اور ہمارا پیچھا چھوڑ دیں۔

انگریزوں نے ملا گوری سے مل کر ہمارے خلاف سازش کر رکھی تھی۔ ملا گوری پیر مانکی صاحب کے مرید ہیں۔ انگریزوں نے انہیں کہا تھا کہ جو سڑک سترے سے ہو کر چارسدے کی طرف پختہ سڑک سے نکلی ہے اس جگہ پشاور سے انیس میل کے

فاصلے پر جب ہم پہنچیں تو وہ ہم پر حملہ کر دیں۔ لیکن ہم نے اپنا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ کا ارادہ تو فساد کرنے کا تھا۔ لیکن انہیں جرات نصیب نہ ہوئی۔ ہم نے پشاور سے اپنے مرکز سروریاب تک سڑک کے دونوں کناروں پر خدائی خدمت گاروں کو ان کی سرخ وردیوں میں ملبوس کر کے کھڑا کر رکھا تھا اور دیہاتوں کے لوگ جنہیں مالاکنڈ کے واقع کی اطلاع مل چکی تھی وہ لوگ بھی اپنے اسلحہ جات لے کر آئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ سرخ پوشوں کے عقب میں کھڑے ہوئے تھے کیونکہ خدائی خدمت گار تو تشدد نہیں کرتے اور اسلحہ اپنے پاس نہیں رکھتے لیکن عام پٹھانوں پر تو یہ پابندی نہیں تھی۔ انہیں ہم سے ہمدردی تھی اور وہ ہمارے ہمدرد تھے۔ وہ لوگ سرخ پوش نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر کوئی تشدد کرے گا تو ہم اسے تشدد کا جواب تشدد سے دیں گے۔

مسلم لیگ کے کچھ لوگ فساد کرنے کی نیت سے ہمارے مرکز میں بھی آئے تھے۔ لیکن انہوں نے ان لوگوں (مسلح دیہاتیوں) کو دیکھا تو بھاگ گئے۔ مرکز میں لاکھوں لوگ آئے تھے۔ خدائی خدمتگاروں نے جلسے کا بہت اعلیٰ انتظام کیا تھا۔ جلسہ نہایت کامیاب رہا۔ اس جلسے میں خدائی خدمت گاروں کی طرف سے جواہر لال نہرو کو ایک سپاسنامہ دیا گیا۔ جواہر لال نے اس کے جواب میں تقریر کی اور اس کے بعد میں نے تقریر کی۔ پھر جلسہ برخاست ہوا۔ ہم پشاور واپس آ گئے اور دوسرے دن جواہر لال نہرو دہلی لوٹ گئے۔

☆☆☆

گاندھی جی کے ساتھ گزرے لمحات

۱۹۴۵ء میں جیل خانے سے باہر آیا تو اس وقت سخت بیمار تھا۔ میں جیل خانے میں ہمیشہ بیمار پڑ جاتا ہوں۔ انہیں دنوں مہاتما گاندھی بمبئی میں تھے۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ میں بمبئی آ جاؤں۔ میں جب کبھی بمبئی یا سیوا گرام جاتا تھا تو ایک رات راستے میں دہلی میں دیوداس گاندھی جی کے صاحبزادے اور راجہ جی کے داماد کے گھر ٹھہرتا تھا۔ دیوداس کی دھرم پتنی بڑی اچھی خاطر مدارات کرتی تھی اور دیوداس کا گھر مجھے اپنا گھر معلوم ہوتا تھا۔ میں یہ نہیں محسوس کرتا تھا کہ یہ کسی غیر کا گھر ہے۔ میں بمبئی چلا گیا۔ گاندھی جی برلا کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ میں بھی انہی کے ساتھ ایک ہی جگہ رہنے لگا تھا۔ ایک دن باتوں باتوں میں عدم تشدد کا ذکر آ گیا میں نے انہیں کہا ”گاندھی جی! آپ تو بڑی مدت سے ہندوستان کو عدم تشدد کا سبق دیا ہے۔ لیکن مجھے تھوڑا عرصہ ہوا ہے کہ میں یہ سبق پٹھانوں کو دے رہا ہوں۔ اس عدم تشدد کو پٹھانوں نے ہندوستانیوں سے زیادہ سیکھ لیا ہے۔ اور آپ دیکھیں کہ ۱۹۴۲ء کی اس جنگ میں ہندوستان میں کتنا تشدد ہوا ہے لیکن صوبہ سرحد میں انگریزوں کی طرف سے اس قدر اشتعال انگیزی اور زور ظلم کے باوجود ایک پشتون نے بھی تشدد نہیں کیا۔ حالانکہ تشدد کا سامان بھی ہم لوگوں کے پاس زیادہ ہوتا ہے۔

اس کے جواب میں گاندھی جی نے مجھ سے کہا ”عدم تشدد بزدل آدمی کا کام نہیں ہے یہ بہادر آدمی کا کام ہے۔ اور پشتون ہندوستانیوں سے زیادہ بہادر ہیں اسی وجہ

سے انہوں نے تشدد نہیں کیا ہے''۔

ہریجن کالونی یا سیوا گرام میں جب ہم رہتے تھے اور جب پرارتھنا کا وقت ہوتا تھا تو سب سے پہلے میں قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتا تھا میرے بعد ایک جاپانی بدھ مذہب کا پیرو کار اپنی مناجات بیان کرتا تھا۔ اور اس کے بعد ایک ہندوؤں کی پرارتھنا شروع ہوتی تھی۔ گاندھی جی کے دل میں سب مذہبوں کے لیے یکساں احترام تھا اور وہ ان تمام مذاہب کو مبنی برحق سمجھتے تھے۔ اور بعینہ یہی میرا عقیدہ ہے۔ قرآن اور گیتا کا مطالعہ میں نے بڑی اچھی طرح کیا ہے اور جب میں سکھوں کے ساتھ ڈیرہ غازی خان جیل میں تھا تو ان سے میں نے گرنتھ صاحب کا کافی حصہ سنا تھا۔ بدھ مذہب کے مطالعے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ کیونکہ ہم لوگ خود بھی اسلام سے پہلے بودھ تھے۔ لیکن بدھ مذہب کی کوئی کتاب میرے ہاتھ نہیں لگ سکی۔ انجیل میں نے طالب علمی کے زمانے مس مشن ہائی سکول میں پڑھی تھی کیونکہ میں اسی سکول کا طالب علم تھا۔ توریت میں نے تھوڑی بہت جیل خانے میں پڑھی تھی زرتشت کے پارسی مذہب کی کتابوں کے مطالعے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ کیونکہ وہ ہماری پٹھان قوم کا پیغمبر تھا۔ جو افغانستان میں بلخ کا رہنے والا تھا۔ لیکن اس وقت تک مجھے یہ لٹریچر میسر نہ آسکا۔ خورشید بہن اور بعض دیگر پارسی دوستوں کو میں نے اس کے لیے کہا تھا لیکن کسی نے کوئی کتاب میرے پاس نہیں بھیجی تھی ''میرا مذہب سچائی پریم پیار اور خلق خدا کی خدمت ہے'' مذہب ہمیشہ دنیا اور آخرت میں محبت کا پیغام لے کر آتا ہے اور در جن لوگوں کے دلوں میں بنی نوع انسان کے لیے رواداری اور پریم پیار نہیں ہوتا

اور جس آدمی کے دل میں نفرت ہوتی ہے۔ایسا آدمی مذہب سے بہت دور ہوتا ہے ۔اور مذہب کی حقیقت سے بہت بے خبر ہے۔

۱۹۴۶ء میں ہندوستان میں جو فسادات ہوء تھے ان کی ابتدا مسلم لیگ نے اپنے کلکتہ کے ڈائریکٹ ایکشن سے کی تھی کلکتہ کے فسادات میں شروع میں تو ہندوؤں کے کچھ آدمی مارے گئے تھے لیکن جب ہندوؤں اور سکھوں نے مسلم لیگ کی مانند تشدد کا اقدام کیا تو پھر اس جگہ کے مسلمانوں کا ناقابل بیان تلافی مالی اور جانی نقصان ہوا۔مسلم لیگ نے اس سلسلے کو جاری رکھنے کی غرض سے نواکھلی میں کلکتہ کا بدلہ لینے کے بہانے سے ہندوؤں نے آسمان اور زمین ایک کردیا۔اور ایسے مظالم توڑے اور بے حیائی سے بھرے کام کیے کہ انسانیت نے شرم کے مارے اپنا منہ چھپا لیا۔فرنگی اپنی پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے مطابق ہندوؤں کو بھی اپنے جال میں لے آئے اور انہوں نے بھی نوکھلی کا بدلہ لینے کے بہانے بہار کے مسلمانوں اور غریبوں پر چنگیز اور ہلاکو کے جور و جفا کی یادیں تازہ کردیں۔مسلم لیگیوں کے دل کی مراد سر سبز ہوگئی۔وہ خدا سے یہ دن مانگتے تھے۔

اسی طرح کے مکروہ اور ناپاک ارادوں کے ساتھ وہ مسلم لیگی یا تو برسر اقتدار آنا چاہتے تھے ارو پھر ملک کے ٹکڑے کرنے پر تلے ہوئے تھے اس لیے کہ انہوں نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہندوستان بھر میں فسادات کی آگ لگا دی اور اپنے ہاتھ رنگنے شروع کردیے۔انگریز لیگیوں کی ان حرکتوں سے بہت خوش تھے۔کیونکہ ہندوستان کی ان خرمستیوں سے انگریز نوکر شاہی انگلستان کی مزدور

پارٹی کی حکومت یہ بات واضح اور ثابت کر دینا چاہتی تھی کہ ہندوستان کے لوگ درندوں کی مانند ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور ایک دوسرے کا گوشت پوست ادھیڑنے کے درپے ہیں اور یہ کہ انسانوں کی طرح رہنے کا شعور کا تو ان میں بالکل فقدان ہے لہٰذا ان کے سروں پر انگریزوں نے حکومت کا تسلط ضروری ہے اور اگر ایسا نہیں ہوگا تو یہ ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر دیں گے۔

مسلم لیگ انگریزوں کی اپنی پیداوار تھی اس لیے انہوں نے بھی صورت حال کا ناجائز فائدہ اٹھانا پسند کیا اور ملک کا امن و سلامتی مٹانے کے لیے انگریز مسلم لیگیوں کی پشت پناہ بن گئے۔

میں خود بہار میں گیا تھا۔ پٹنہ کے ضلع میں مسلمانوں کی بڑی بھاری تباہی ہوئی تھی۔ اس صوبے میں جگہ جگہ گھروں کو لوٹا اور برباد کیا گیا تھا اور آگ لگا دی گئی تھی اور بہت سے لوگ بھی ان میں مارے گئے تھے۔ میں نے جب اس علاقے کا دورہ کیا اور دیہات کو دیکھا تو ویران و برباد پڑے تھے اور لوگ وہاں سے بھاگ گئے تھے اور جو لوگ ان میں رہ گئے تھے وہ سب کیمپوں میں پڑے تھے۔ لیکن ان کی اس قدر تباہی پر بھی مسلم لیگ کا دل ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا وہ اسی طرح فرقہ وارانہ سازشوں میں لگے ہوئے تھے۔ انہی مظلوموں سے سیاسی استفادہ کر رہے تھے اور انہیں یہ ترغیب دے رہے تھے کہ بنگال میں ہجرت کر جاؤ اور میں اس فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ انہیں پھر سے اپنے آبائی گاؤں اور گھروں میں ازسرنو آباد کر دوں' لیکن مسلم لیگیوں نے ایسے تان پر چڑھایا ہوا تھا کہ میری باتیں انہیں اچھی نہیں لگتی تھیں اس

لیے میں مسلم لیگیوں کے لیڈروں کے پاس گیا۔ یہ لوگ محمد یونس بیرسٹر کے ایک عالیشان مکان میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور جب بھی میں ان کے ہاں گیا ہوں تو وہ کھانے پینے میں لگے ہوئے ہوتے تھے۔

میں نے انہیں کہا کہ میں آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں اور آپ کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ بہت دیر ہو چکی اب ان غریبوں کو معاف کر دو۔ جو تباہی ان کی ہو چکی ہے کیا یہ کم تباہی ہے؟ اگر آپ لوگ انہیں بنگال میں ہجرت کر جانے کا مشورہ دیتے ہیں اور حقیقی معنوں میں انہیں وہاں آباد کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور اگر انہیں اپنی سیاسی غرض کے آلہ کار بنانا چاہتے ہیں تو یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ لوگ کافی تباہ ہو چکے ہیں اور انہیں زیادہ برباد نہ کریں''۔

لیکن ان مسلم لیگیوں کے دل میں رحم کہاں تھا۔ انہوں نے انہیں بہاریوں کو بنگال کی طرف بھجوا دیا برسات کا موسم قریب تھا اور میرا خیال یہ تھا کہ برسات شروع ہونے سے پہلے ان کے مکانات تیار ہو جائیں اور یہ لوگ اپنے گاؤں میں آباد ہو جائیں۔ لیکن مسلم لیگیوں نے میرے ساتھ اس بات پر اتفاق نہ کیا' کیونکہ وہ لوگ آبادی کے لیے تو ہیں نہیں وہ تو بربادی چاہتے ہیں' جو مسلمان بنگال گئے ان کی حالت اس سے بھی بدتر ہوئی۔ کچھ تو راستے میں ہی مر گئے تھے اور کچھ بنگال میں جا کر مر گئے اور جو باقی بچے وہ واپس پٹنہ آ گئے۔ اب ان کے دماغ قدرے ٹھکانے آ گئے تھے اور یہ بات بھی ان کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ مسلم لیگی ان کے لیے کچھ کرتے کراتے تو ہیں نہیں اور نہ ہی کچھ کر سکتے ہیں بلکہ انہیں اپنے سیاسی مقاصد کے لیے

استعمال کر رہے ہیں اور انہیں کسی قسم کی امداد مہیا نہیں کرتے اور نہ ہی کر سکتے ہیں۔

بہت سے ایسے مسلمان جنھوں نے زمین میں اپنے مال دفن کیے تھے چاہتے تھے کہ کوئی ایسا آدمی مل جائے جو ان کے ساتھ جا کر ان کا مال زمین سے نکالنے میں ان کی مدد اور رہنمائی کرے۔ لیکن مسلم لیگی تو ڈر کے مارے پٹنہ سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ صرف میں ہی واحد آدمی تھا جو انہیں ان کے دیہات میں لے جاتا تھا اور وہ اپنے اپنے دفینے زمینوں سے نکال لیتے تھے۔ الغرض میں نے یہ کام بخوبی ان کے ساتھ سرانجام دیا اور کسی نے بھی کوئی تعرض نہ کیا اور نہ ہی کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی اور نہ ہی کسی کو میری موجودگی میں انہیں چھیڑنے کی جرات ہوئی۔ بڑی تکالیف اور مصائب کے بعد یہ لوگ میرے پاس آئے۔ اور مجھے کہا کہ برسات آنے والی ہے۔ اگر میں حکومت پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں مکانات بنوا دوں تو وہ اپنے اپنے گھروں اور گاؤں میں جانا چاہتے ہیں۔ میں نے حکومت سے کہہ دیا اور حکومت نے فوراً ان کی آبادکاری کے لیے حکم جاری کر دیا۔ اور گاؤں میں گھر بننے شروع ہو گئے۔

برسات قریب تھی کام ہو رہا تھا اور بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام پا رہا تھا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اگر مہاتما جی بہار آ جائیں تو یہ کام اور بھی تیز رفتاری سے ہونے لگے گا اور وہ برسات شروع ہونے تک تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ اس لیے میں نے مہاتما جی کو لکھا۔ وہ ان دنوں نواکھلی میں تھے کیونکہ وہاں بھی بڑی بربادی ہوئی تھی۔ مہاتما جی میرا خط دیکھتے ہی بہار آ گئے اور علاقے کا دورہ شروع کر دیا اور مسلمانوں کی بڑے

حوصلہ افزائی اور دلجوئی کی ۔ان کو ہر طرح تسلی دی ۔ان کے آنے سے کام بھی بڑے زور وشور سے شروع ہو گیا۔مردولا بہن بھی گاندھی جی کے ہمراہ تھیں اور وہ اس وقت مہاتما جی جی سیکرٹری تھیں ۔ انہیں بھی مسلمانوں کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی اورانھوں ے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی جس کی وجہ سے میں ان کا ابھی تک شکر گزار ہوں ۔اوراس جگہ ہی میرا مردول سے باپ و بیٹی کا اچھا رشتہ قائم ہوا۔جسے ہم دونوں ابھی تک نبھار ہے ہیں ۔

بہار کے بعد پنجاب اور سرحد کی باری آ گئی ۔ جہاں بہار کا بدلہ لینے کی غرض سے مسلم لیگیوں نے نہ صرف ہندوؤں اور سکھوں پر زمین و آسمان تنگ کر دیا تھا۔ بلکہ ہمارے صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گاروں کی آئینی حکومت ختم کرنے کی غرض سے غیر آئینی سرگرمیاں اور غنڈہ گردی شروع کر دی تھی ۔میں اس موقع پر بہار کے مصیبت زدہ اور مظلوم مسلمانوں کی امداد وخدمت کے لیے بہار میں تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر خان کی حکومت کے خلاف مسلم لیگ کی سازش

صوبہ سرحد کی اسمبلی کا اجلاس شروع تھا۔ پنجاب میں ملتان، امرتسر، انبالہ، راولپنڈی اور گجرات وگوجرانوالہ، وغیرہ مقامات پر فسادات ہوئے، ان کے شعلے پشاور بھی آن پہنچے۔ حملے اور بد کلامیوں کے ذریعے مسلم لیگیوں نے ڈاکٹر خان صاحب سے مستعفی ہونے کے مطالبے کرنے اور نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے پشاور کے بازاروں اور گلیوں میں بے گناہ لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ضلع ہزارہ کی ایک ہندولڑکی کو حاصل کرنے کے لئے ''لیگی سول نافرمانی'' بھی شروع ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب کی وزارت کو ٹھوس اکثریت حاصل ہونے کی وجہ سے ہٹا دینا تو ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن انہوں نے بدمعاشی اور غنڈہ گردی کے طریقے اور راستے اختیار کر لیے۔ مرکزی عبوری حکومت میں جواہر لال اور دیگر کانگرسی وزیروں کا مسلم لیگ کے عدم تعاون کی وجہ سے ناک میں دم آچکا تھا۔ حتیٰ کہ کانگرس خلاف توقع ملک کی تقسیم کا مطالبہ منظور کرنے کے لئے بھی تیار ہوگئی۔ اور جس وقت 3 جون 1947ء کو لارڈ مونٹ بیٹن کی طرف سے تقسیم کا اعلان ہوا اور کانگرس اور مسلم لیگ نے دستوری طور پر پاکستان کو تسلیم کرلیا تو ڈاکٹر خان صاحب نے تمام مسلم لیگیوں کو جیل سے رہا کر دیا۔ اور ویسے بھی انگریزوں نے جیل خانے میں مسلم لیگیوں کے لئے کلب گھر بنا رکھے تھے۔ صوبہ سرحد کی جیلوں کے اکثر قیدی راتیں اپنے گھروں میں گزارتے تھے۔ اور اکثر کھلے بندوں بازاروں میں گھوما پھرا

کرتے تھے۔

کانگریس کی حکومت برائے نام ہی تھی۔ ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ سرکاری افسران اور انگریز مطلق تعاون نہیں کرتے تھے۔ لیکن ہندوؤں کو اس وزارت سے بڑا فائدہ یہ حاصل تھا کہ انگریز گورنر ان کی مکمل تباہی اس وجہ سے نہیں کرسکتا تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب اس میں سدراہ تھے، اور ساتھ یہ بھی درست ہے کہ گورنر بھی ڈاکٹر خان صاحب کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ اور وہ اسے ہندوؤں کی پوری پوری حفاظت نہیں کرنے دیتا تھا۔ لیکن گورنر اور ڈاکٹر خان صاحب کے درمیان اختلافات اور ڈاکٹر خان صاحب کی پٹھان اسپرٹ اقلیتوں کی حفاظت کا موجب تھی۔

بعض انگریز پرست، ٹوڈی ہندو انگریزوں اور مسلم لیگیوں کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ ایسے حالات میں مطالبہ کررہے تھے کہ خدائی خدمت گاروں کی وزارت کو ہٹا دیا جائے۔ اور صوبوں میں گورنری راج قائم کردیا جائے۔ وہ گورنر کیر جو ہندوؤں کا کٹر دشمن اور مسلم لیگیوں کا یار غار تھا۔ اور یہ لال بجھکڑ اپنے مطالبے کے حق میں یہ دلیل دیتے تھے کہ کانگریس وزارت یعنی خدائی خدمت گاروں کی حکومت ہماری حفاظت کے اہل نہیں ہے۔ لیکن یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اپنے پاؤں پر اپنے ہاتھوں سے کلہاڑا چلارہے ہیں۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

پشاور شہر کے بازار بند تھے، ہندو سکھ اپنے گھروں میں قید تھے، باہر نکلنا محال تھا۔ اور گھروں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کی عزت محفوظ نہ تھی۔ اس موقع پر دس

ہزار خدائی خدمت گار ہندوؤں کی حفاظت کے لئے پشاور پہنچ گئے۔ اور ان کے آتے ہی ہندو اور سکھ اپنے گھروں سے باہر نکل آئے، اور دکانیں کھول کر اپنا کام دھندا شروع کر دیا۔ ان کے جان و مال محفوظ ہو چکے تھے، اور عین اس طرح جہاں جہاں خدائی خدمت گار تھے، وہاں ہندوؤں کا جان، مال اور عزت محفوظ تھی۔ کیونکہ خدائی خدمت گار دن رات ان کی حفاظت کرتے تھے۔ اور ان کے لئے پہرہ دیتے تھے۔

پھر الیکشن کے وقت مسلم لیگ نے صوبہ سرحد میں پروپیگنڈے کے لئے ایک پنجابی کو بھیجا۔ جس کا نام میجر خورشید تھا۔ یہ اپنی بدعملی کی وجہ سے فوج سے موقوف کیا گیا تھا۔ اسے اس غرض اور مطلب کے لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ پٹھانوں میں خانہ جنگی پیدا کر دے۔ وہ پشاور کے مسلم لیگیوں میں اس قسم کی تقریریں کیا کرتا تھا۔ جو تشدد آمیز جذبات سے بھری ہوتی تھیں۔ اور وہ کہا کرتا تھا کہ یہ جو چند آدمی کانگریسی لیڈر ہیں، اور قوم میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں، انہیں قتل کر دینا چاہیئے۔ اور ایسے لوگ پیدا کرنے چاہیئں جنہیں ہم دس، دس، بیس ہزار روپے دیں تا کہ وہ ان آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ کیونکہ ان کی موت کے بغیر ہمارا راستہ صاف نہیں ہو سکتا۔

اس کی ان تقریروں کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ آپس میں دست و گریبان ہو جائیں گے۔ اور خدائی خدمت گار کا اگر ایک رہنما بھی مار دیا جائے تو چونکہ قوم کی ہمدردیاں خدائی خدمت گاروں کے ساتھ ہیں۔ اس لئے بدلہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ قوم مسلم لیگ کے لیڈروں کو قتل کرے گی۔ اور اس طرح یہ لوگ اپنے گھر میں باہمی فساد اور جنگ و جدل میں مصروف ہو جائیں گے۔ اور تباہ و برباد ہو جائیں

گے۔میجر خورشید صرف ہمیں ہی تباہ نہیں کرنا چاہتا، بلکہ ساری پختون قوم کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔

جب ہمارے لوگوں کو خورشید کے ان ارادوں یا اسکیم کا علم ہوا تو انہوں نے خدائی خدمت گاروں کی حفاظت کے لئے نئی جماعت بنا لی، جس کا نام ''دحکمی پشتون تھا۔'' اور اس میں وہ نوجوان شامل تھے، جن کا عقیدہ عدم تشدد پر مبنی نہیں تھا۔کیونکہ انھوں نے اسی غرض سے یہ جماعت بنائی تھی کہ خدائی خدمت گار تو تشدد نہیں کرتے، اور ان کا عقیدہ عدم تشدد پر مبنی ہے۔اور ان کے خلاف پر تشدد سازشیں چل رہی ہیں۔تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ خدائی خدمت گاروں کی حفاظت کریں گے۔ اس جماعت کے مقابلے میں مسلم لیگ نے غازی پختون کے نام سے جماعت بنا لی، لیکن ساری قوم ''دحکمی پشتون'' کی پشت پر تھی۔چند خوانین اور ملک وغیرہ جو انگریزوں کے ریزہ چین تھے۔مسلم لیگ کے ساتھ تھے، وہ سمجھ گئے تھے کہ اگر میجر خورشید کی بات پر عمل کرتے ہیں تو ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔اس لئے انہیں میجر خورشید کے پروگرام پر عمل کرنے کی جرات نہ ہوسکی۔میجر خورشید کو پنجابیوں نے پٹھانوں کی بربادی کے لئے بھیجا تھا،لیکن وہ اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔

تقسیم ہند کے مسلے پر کانگرس کا رویہ

کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس تھا۔ میں اس میں شمولیت کے لیے دہلی گیا تھا۔ اس کمیٹی میں ہندوستان کی تقسیم کا سوال زیر بحث تھا۔ میں اور گاندھی جی تقسیم ہند کے مخالف تھے۔ دوسرے ممبروں کے بارے میں میں کچھ نہیں سکتا۔ کیونکہ میں نے اس وقت تک ان سے کچھ نہیں سنا تھا۔ لیکن سردار پٹیل اور رراج گوپال اچاریہ تقسیم کے حق میں تھے۔ اور اس بارے میں انہوں نے بڑا زور لگایا تھا۔ دوسری بات صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کا سوال تھا۔ میں اور گاندھی جی دونوں ریفرنڈم کے بھی مخالف تھے، میں کہتا تھا کہ ریفرنڈم کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کے سوال پر ہمارے صوبے کا الیکشن ہوا ہے۔ اور وہ الیکشن ہم نے بڑی بھاری اکثریت سے مسلم لیگ سے جیتا ہے۔ اور اسے ابھی تک ایک سال بھی نہیں ہوا ہے۔

سردار پٹیل اور رراج گوپال اچاریہ اس نظریئے کے مخالف تھے۔ اور ریفرنڈم کے حق میں تھے۔ اور اسی لئے انہوں نے ورکنگ کمیٹی میں بہت زور لگایا تھا۔ اور دلائل پیش کیے تھے۔ جب ورکنگ کمیٹی نے ان کی بات تسلیم کر لی، اور ملک کی تقسیم اور ہمارا ریفرنڈم دونوں باتیں منظور کر لیں۔ اس وقت میں نے ورکنگ کمیٹی اور گاندھی جی سے کہا کہ ہم پٹھان لوگ آپ کے ساتھی ہیں۔ اور ہم نے ہندوستان کی آزادی کے لئے بڑی قربانیاں کی ہیں۔ لیکن آپ لوگوں نے ہمیں چھوڑ دیا ہے، اور بھیڑیوں کے سپرد کر دیا ہے۔ کیونکہ ہم نے ہندوستان اور پاکستان کے سوال پر

ہمارے صوبے کا الیکشن ہوا ہے۔اور وہ الیکشن ہم نے بڑی بھاری اکثریت سے جیتا تھا۔اور اس سے ساری دنیا پر پختونوں کی رائے روشن ہوگئی تھی۔اس وجہ سے ہم ریفرنڈم نہیں چاہتے۔اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں تو ہندوستان نے چھوڑ دیا ہے، پھر ہم ہندوستان اور پاکستان کے سوال پر ریفرنڈم کیوں کریں۔

کانگریس کی اس کمزوری سے ہمارے لوگ ہندوستان سے بڑے سخت مایوس ہو گئے۔اس لئے ہم نے کہا کہ اگر مسلم لیگ ہمارے ساتھ ریفرنڈم کرنا چاہتی ہے تو پھر ''پختونستان اور پاکستان'' کے سوال پر کرے۔افسوس مجھے اس بات پر تھا کہ ہم نے تو کانگریس کو نہیں چھوڑا تھا۔لیکن کانگریسیوں نے ہمیں چھوڑ دیا تھا۔اگر ہم کانگریس کو چھوڑ دیتے تو انگریز ہمیں سب کچھ دیتا۔اور میرا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ اگر کانگریس نے اس بات پر زور دیا ہوتا، مضبوطی سے ڈٹی رہتی، جس طرح وہ گورداس پور کے سوال پر اڑ گئی تھی۔اور جس طرح کی جناح نے ان کی وہ بات مان لی تھی۔تو یہ بھی مان جاتے، ہماری بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ گاندھی جی دنیا سے چلے گئے۔اگر وہ ہوتے تو ضرور ہماری امداد کرتے۔جواہر لال سے بھی ہمیں بہت سی توقعات تھیں۔اور وہ بھی بہت کچھ کر سکتے تھے۔لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ کیوں انھوں نے ہمارے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔؟۔

جس وقت ورکنگ کمیٹی نے ہندوستان کی تقسیم اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کا فیصلہ کرلیا تو میرے لئے یہ فیصلہ مرگ تھا۔میں حیران و پریشان بیٹھا ہوا تھا۔اور مولانا آزاد میری بغل میں بیٹھے ہوئے تھے۔مولانا نے مجھ سے کہا کہ تمہیں چاہیئے

کہ اب تم مسلم لیگ میں داخل ہو جاؤ۔'' مجھے افسوس بھی ہوتا ہے اور میں حیران بھی ہوتا ہوں کہ مولانا صاحب کس خیال سے مجھے یہ مشورہ دے رہے تھے۔ کیونکہ مسلم لیگ سے میرا اور مولانا کا اختلاف نظریاتی اور اصولی تھا۔ اور اس وقت تک مسلم لیگ کی پالیسی میں ایسی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ کہ میرے یا مولانا کے لئے اس میں شامل ہو جانے کا جواز پیدا ہو جاتا۔ مسلم لیگ تخریب کے لئے کام کر رہی تھی ،اور میں نے ساری عمر تعمیر کے لئے وقف کی ہے۔ مولانا کا مشورہ اگر درست بھی تھا تو مناسب ہوتا کہ اگر وہ چند سال پہلے ایسا مشورہ دینے میں بخل سے کام نہ لیتے۔ بہر حال مجھ پر اس مشورے نے کوئی اچھا اثر نہ کیا۔ کیونکہ میں عقیدوں کے مسائل کو وقت کے تقاضوں کے ساتھ بدلنا نہیں جانتا اور نہ ہی میرا ملک اور میری ملت گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والوں کو اچھا جانتی ہے۔ جس وقت احرار جماعت مجلس احرار اسلام پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ میں داخل ہوئی تھی تو لیاقت علی نے انہیں نہایت ذلیل کر کے مسلم لیگ سے نکال دیا تھا۔

ایک بات مولانا نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ ''کلکتہ میں مجھ سے ملنے کے لئے کچھ پٹھان آئے تھے۔'' جب میں نے چائے کے ساتھ پٹھانوں کو سکٹ پیش کیے،تو انھوں نے کہا کہ ہم نے یہ چیز کبھی نہیں کھائی ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب اور باچا خان کھاتے تھے،لیکن وہ ہمیں نہیں دیتے تھے۔

مولانا صاحب بہت دفعہ سرحد آئے تھے،اور انھوں نے میری طبیعت ،خصلت اور عادت اور پٹھانوں کی مہمان نوازی بھی دیکھی تھی۔ اور انھوں نے یہ بھی دیکھا ہو

گا کہ ہمارے اندر کس قدر مساوات ہے۔ پٹھانوں میں اتنی غربت نہیں ہے کہ انھوں نے بسکٹ دیکھا نہ ہو یا کھایا نہ ہو۔ ہم تو مہمان کی بات چھوڑیئے، اپنے نوکروں کے ساتھ روٹی اور چائے ایک ہی جگہ کھاتے پیتے ہیں۔اور جو کچھ خود کھاتے ہیں، انہیں بھی دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ بات بڑی معیوب ہے کہ چائے پیتے جاؤ بسکٹ کھاتے جاؤ۔اور اگر کوئی ساتھ بیٹھا ہے، تو اسے نہ دو۔اس لئے میں نہیں جانتا کہ مولانا کے پاس کون اور کس قسم کے لوگ گئے تھے۔

''مولانا صاحب'' نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''ڈاکٹر خان صاحب اور باچا خان کانگریس فنڈ اپنے صوبوں میں خرچ کرنے کی بجائے مرکز کو واپس کر دیا کرتے تھے۔''اور بقول مولانا ہماری یہ کفایت شعاری ہمارے اثر ورسوخ کے کم ہو جانے یعنی گھٹ جانے کا سبب بیان کیا گیا ہے۔

خدائی خدمت گار تحریک دوسری تحریکوں کی طرح صرف سیاسی تحریک نہیں ہے۔ یہ سیاسی بھی ہے، اور مجلسی بھی ہے، اقتصادی اور اصلاحی بھی ہے۔اخلاقی اور روحانی بھی ہے۔

خدائی خدمت گار اپنی قوم اور ملک کی خدمت خدا کے واسطے کرتا ہے۔حتیٰ کہ اپنی وردی بھی اپنے پیسوں سے بناتا ہے۔ہم نے اپنی وردی کے لئے کبھی کانگریس سے پیسے نہیں لیے۔اگر کانگریس نے پیسے دیئے ہوں گے تو پارلیمنٹ بورڈ کو دیئے ہوں گے۔اور ہم لوگ قومی فنڈ کو بے جا استعمال کرنا خدا کے نزدیک جرم سمجھتے ہیں۔اگر ہماری تحریک کا رسوخ کم ہوتا تو پاکستان کے اتنے تشدد، جبر، استبداد اور ظلم

، اتنے توہین آمیز سلوک، یہاں تک کے آئے دن جان لیوا گولیوں کا نشانہ بننے کے باوجود ہزاروں لوگ کس طرح جیل خانوں میں جاتے۔ اور جیلوں میں سختیاں اور شرم ناک زندگی صبر و شکر سے کیوں گزارتے؟۔ کاش مولانا صاحب اس قسم کی ایک مثال بھی کسی دوسری جماعت کے متعلق ہمیں بتاتے۔

خیر میں خوش ہوں کہ مولانا صاحب نے اس طرح سے دنیا کے سامنے ایک حقیقت تو تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے کانگریس سے پیسے کبھی نہیں کھائے۔ اور ہمارا تعلقاس کے ساتھ ایک مشترکہ نصب العین کے تحت کام کرنا تھا۔ اور کچھ نہیں ۔۔۔۔ مولانا صاحب کا یہ نکتہ کہ کانگریس کے یہ پیسے کانگریس کو واپس کر دیتے تھے۔ میری طرف سے ایک وضاحت طلب کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدائی خدمت گار تحریک کبھی ان پیسوں کی دست نگر نہیں رہی۔ یہ پیسے اگر دیئے گئے ہوں گے تو پارلیمنٹری بورڈ کو دیئے ہوں گے۔ رہا یہ سوال کہ ان پیسوں کا خرچ نہ کرنا بقول مولانا صاحب ہمارے اثر و رسوخ میں کمی کا باعث ہوا۔ اس سلسلے میں عرض کرتا ہوں کہ مولانا صاحب نے تقسیم ہند سے قبل ہماری طاقت کا اندازہ کیا تھا کہ خدائی خدمت گار تحریک جب خلاف قانون نہیں ہوئی تھی تو وہ ہمیشہ الیکشن میں جیت حاصل کرتی تھی۔ اور حکومت اپنے ہاتھوں میں لیتی رہی تھی۔ تقسیم کے بعد اور پاکستان بننے کے بعد پاکستان میں کوئی الیکشن نہیں ہوا، جس سے کہ مولانا ہمارے زور یا کمزوری کا جائزہ لیتے، اور کسی نتیجے پر پہنچتے۔ یا کوئی نتیجہ اخذ کرتے۔

میں بہت شکر گزار ہوں گا کہ اگر پاکستان میں پھر رائے شماری ہو جائے۔ تا کہ

دنیا دیکھ لے کہ **ملک** اور قوم کس راستے پر اور کس کے پیچھے چل رہے ہیں۔

میرا سارا مجادلہ بھی اسی کے لئے جاری ہے۔ البتہ مولانا صاحب یا اور کسی کو الیکشن کے بغیر کسی اور دلیل کی ضرورت ہو تو میں عرض کروں گا کہ یہ ہزاروں لوگوں کا گلنا سڑنا، سینکڑوں لوگوں کا مارا جانا، **ملک** چھوڑ کر چلے جانا، ان کی جائیدادوں کی ضبطی کس چیز پر دلالت کرتی ہے؟۔ یا مجھے جیل میں رکھا جانا کس واسطے ہے؟۔ اگر میرا یا میری پارٹی کا اثر و رسوخ نہیں ہے، تو حکومت پاکستان ہم سے ڈرتی کیوں ہے؟۔ اور مجھے کیوں جیل خانوں میں بند کرتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد داستان اسیری

بٹوارہ ہو چکا تو میں نے کہا کہ اب جب پاکستان بن چکا ہے۔ اور کانگریس اور مسلم لیگ نے تقسیم مان لی ہے، تو میں اور میری پارٹی بغیر کسی قسم کا حصہ مانگے ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ میری قوم پاکستانی شہری اور وفادار ہے۔ اور ہم اس ملک کی تعمیر و ترقی میں پورا حصہ ادا کریں گے۔ لیکن پاکستانی حکومت کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور الٹا مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ تعمیر کی آڑ میں تخریب چاہتا ہوں، لہذا مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ مجھ پر قبائلیوں سے ساز باز کرنے کا جھوٹا الزام لگایا گیا۔ اس جرم میں میرے بیٹے ولی خاں کو بھی پکڑ لیا گیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر خان اور عبد الغنی بھی گرفتار کر لیے گئے۔ بغیر کسی دلیل کے مجھے تین برس کی سزا دے دی گئی۔

قید کی معیاد تین سال گزرنے کے بعد مجھے کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کے سامنے پیش کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے مجھ سے نیک چلنی کی ضمانت طلب کی۔ میں نے اس ضمانت طلب کی وجہ دریافت کی تو جواب ملا کہ میں پاکستان کے خلاف ہوں۔ جب میں نے اس بات کا ثبوت مانگا تو کہنے لگے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ تب میں نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا۔ جس پر انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور تین برس قید با مشقت کی سزا دی۔ اور منٹگمری جیل بھجوا دیا گیا۔ جہاں میں نے اپنی سزا کے دن کاٹے۔ مجھے سزا میں وہ رعایت بھی نہ دی گئی جو جیل کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور جب میں سزا بھگت چکا تو ۱۸۱۸ء ریگولیشن کے تحت مجھے پھر نظر بند کر دیا گیا۔ اور اس

طرح جنوری 1954ء قبل مجھے رہائی نصیب ہوئی۔اور جب رہائی ملی تو وہ بھی برائے نام، میری گرفتاریوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔اور اس طرح مجھے پندرہ سال تک پاکستانی جیلوں میں رہنا پڑا۔

جونہی پاکستان کی حکومت وجود میں آئی تو بغیر کسی تقصیر کے ہم پر ایسے ایسے مظالم توڑنے شروع کر دیئے کہ جو کافر فرنگیوں کے دور حکومت میں بھی ہم پر نہ رکھے گئے تھے۔ہمارے گھروں کو فرنگیوں نے نہیں لوٹا تھا۔لیکن پاکستان کی اسلامی حکومت نے لوٹ لیے۔فرنگی کے عہد میں اخبار اور جلسے بند نہیں کیے گئے تھے۔لیکن پاکستان کی اسلامی حکومت نے بند کر دیئے۔فرنگی کی حکومت پختونوں کی عورتوں کی بے عزتی نہیں کرتی تھی۔لیکن پاکستان کی اسلامی حکومت نے یہ بھی کیا۔ان سب باتوں کا ذکر چھوڑیئے۔اس حکومت نے تو مظالم کی کوئی حد نہ چھوڑی۔جس وقت چارسدہ میں پٹھان مرد و زن جمعہ کی نماز ادا کرنے اور اپنے گرفتار شدہ بھائیوں کے لئے دعایں مانگنے جا رہے تھے اور اپنے سروں پر ''قرآن'' رکھ کر داخل ہو رہے تھے تو اس وقت لیکن پاکستان کی اسلامی حکومت کے مشین گن چلانے والے سپاہیوں نے پٹھان مردوں اور عورتوں کے سینے اور خدا کے قرآن پر گولیاں چلا کر انہیں چھلنی کر دیا۔

ٹھیک اسی طرح جس طرح جیل میں انگریز حکومت جو سلوک ہمارے ساتھ روا رکھتی تھی۔اس کے مقابلے میں اس پاکستان کی اسلامی حکومت نے ہمارے ساتھ دس گنا برا سلوک روا رکھا۔پاکستانی حکومت نے مجھے ہمیشہ ایسی کوٹھری یا ایسی بارک میں رکھا، جس کی روشنی بھی رات کو گل کر دی جاتی تھی۔حیدر آباد جیل میں تو مجھے قید

تنہائی میں رکھا گیا۔اور کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔اس جیل کی آب وہوا میرے موافق نہ تھی۔ بلکہ مضر تھی۔ وہاں میں بیمار پڑ گیا۔ مجھے گردے کی خرابی کی شکایت پیدا ہوگئی۔جس سے میرے پاؤں خراب ہوگئے۔لیکن جیلر نے جو پنجابی مسلمان تھا۔میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔اور برائے نام غلط ملط دوائیں دیتا رہا۔ آخر مجھے لاہور جیل منتقل کر دیا گیا۔وہاں بھی بیماری بڑھتی گئی۔ یہاں سے منٹگمری جیل بھیج دیا گیا۔اور کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔وہاں بھی بیماری نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میری صحت روز بروز گرتی ہی گئی۔

میں نے انگریزوں کی جیل میں پندرہ برس کاٹے اور لیکن پاکستان کی اسلامی حکومت میں بھی پندرہ برس قید میں گزارے۔پاکستان کی سرکار کی طرف سے مجھے سزائے قید جرمانے کے ساتھ ہوتی تھی۔میری جائیداد کا ایک حصہ صرف پندرہ ہزار روپے جرمانے کے عوض پاکستانی حکومت نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔حالانکہ اس کی اصل قیمت پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔انگریز حکومت اگر ظلم کرتی تھی تو وہ ہماری دشمن تھی۔ ہمارا اس کے ساتھ جھگڑا تھا۔لیکن اس پاکستان کی اسلامی حکومت کو میں سمجھ نہیں سکا۔کہ کس جرم کی پاداش میں اس نے مجھے اور ہزاروں دیگر خدائی خدمت گاروں کو قید و بند میں ڈالا۔

میرے نزدیک پاکستان سے دوستی ممکن ہی نہیں۔کیونکہ پاکستان کی بنیاد نفرت پر رکھی گئی ہے۔پاکستان کی گھٹی میں نفرت ،بغض وحسد۔کینہ ودشمنی اور حقارت کے جذبات بھرے پڑے ہیں۔ پاکستان کی تشکیل انگریزوں کی مرہون منت ہے۔ پاکستان انگریزوں نے اس لئے بنایا کہ زندگی بھر ہندو مسلم فسادات ہوتے رہیں۔

The End-------------- ختم شد